Kitab Kar

1547

مضامین فرحت

حصہ اول

از

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے
حیدرآباد دکن

قیمت

ڈیڈیکیشن

بنام آں کہ اُو نامے ندارد

اکثر اہل قلم نکتہ چینی کے خوف سے کسی بھاری بھرکم نام کا
سہارا لئے بغیر میدانِ اشاعت میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔
مگر میرے آزاد خیالات کے غیر مستند صحیفوں تم اپنے اوپر کم ہمتی کا تمغہ نہ
لگاؤ اپنے بل بوتہ پر مقابلہ کیلئے میدان میں اُتر جاؤ، خود ہنسو دوسروں کو
ہنساؤ۔ اگر کوئی سمجھدار پڑھنے والا مل جائے تو اسکے کتب خانہ کی
زینت بڑھاؤ اور نہ کسی نا اہل کے ہاتھوں شہید ہو کر پنساری کی
پڑیوں میں کام آؤ۔

مرزا الم نشرح

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری

اور

کچھ انکی زبانی

اللہ اللہ۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہیں اور دانی مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ اُن کا طرزِ بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا، ان کی خوش مذاقی خود اُن کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی۔ اُن کی تکلیفیں خود اُن کو پُر نم اور ہم کو تڑپاتی تہیں، اور آج وہ دن ہے کہ اُن کے حالات زبانِ قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی ''اخوت اسلامی'' کا سبق پڑھے ہوئے تھی، اوسکو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا، وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی اسس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑا، وہ اپنے دست و بازو کے بہروسہ پر اس میدان میں اُترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بآسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں

آپ نے تو ہمیشہ (I am a self made man) کا فقرہ ضرور استعمال کیا کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو، انسان فطرت سے مجبور ہے، جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نا اہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ اُن کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری، ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آباؤ اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، اُن کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپیہ کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا، بہت کچھ لکھ لیا تھا وہ پھاڑ ڈالا کہیں ایسی چھوٹ پٹ کشمکش میں نہ پڑ جاؤں، رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا، خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اس گرگر سے نکالا، اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا، خواہ کوئی بُرا مانے یا بھلا، جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں اُن کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر

پہنچ جائے، اور یہ چند صفحات ایسی سوانحعمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جانے کو لکھی گئی ہو، میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا۔ کیوں کہ یہ بناوٹ کی صورت ہے، جس موقعہ پر جو کچھ سنا یا دیکھا اسکو جوں کا توں لکھدوں گا، اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبان میں بیان کیے جائیں۔ انشاء اللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہو گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اسکی مجھے پروا نہیں میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں، اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں سود در سود لگا کر تاوان وصول کریں گے۔

اب طرز بیان تو میں اس میں متانت کو بالائے طاق رکھدیتا ہوں کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں اُن کی توہین کرنا ہے بلکہ یوں کہو کہ سید انشا کو میر اور مارک ٹوئین کو ایمرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انہوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دیکر دعوے دار ہوں۔

چل رے خامہ بسم اللہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں میاں نداقی نے اور میں نے ہندو کالج دہلی سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے، ایف اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور ان کا عربی تھا، انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ

بی۔ اے میں عربی لے لو، دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی، اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی، مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا۔ یہ بھی نہ سمجھا اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہوگیا۔ القصہ ہم دونوں بی اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہوگئے، ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے، عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوف کی باتوں میں گذر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ وافی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کرلیتا تھا اب وہی صرف و نحو ہمیں تو کورے کا کورا ہی رہا۔ سنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی" لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے" ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر بیت اللہ چل دیئے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، اُن سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انہوں نے کورا جواب دیدیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کرسکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کرلو، میں نے وافی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی اب میرے کہنے سے تم سائنس لے لو، جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلو، بقول شخصے "مرتا کیا نہ کرتا" وہ راضی ہوگئے دفتر میں جاکر لیکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ لیکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا "تنگ آمد و سخت آمد جب وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے" کی صورت آپڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی، دونوں سر ملا کر بیٹھے مشورہ کیئے، ریزولیوشن

پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودۂ کلان بردار" کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیئے، دلی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے ایک مولوی محمد اسحٰق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خانصاحب ایل۔ ایل ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خانصاحب، پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی، اسلئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے، آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے مولوی صاحب آج نکلتے ہیں نہ کل، خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی، ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے، ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اسلئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ سرمگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک سفید جبہ اور سب سے آخر زردبانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں، آہستہ آہستہ انہوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا، ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جا لیا، اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فرشی سلام کیا، وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں، میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے، وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلے والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے پوچھا، میں نے آپ صاحبوں کو

نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے، ہم رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے، فرمانے لگے "تم کو معلوم ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں" بجنسہٖ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کئے جیسے اس زمانہ میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر ہوں" لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں، فرمانے لگے کہ "تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجیے" ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہرحال کچھ بھی ہو، انہوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھ، وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے، ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرزِ عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا، جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے، چلو امید پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لیے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے، ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے [illegible] ضرور ہے، وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور ریزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبدالرحمٰن کی آڑ میں کیا جائے

اب میاں عبدالرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجیے، ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ جوتوں کی دوکان تھی، مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آ کر بیٹھتے تھے، عبدالرحمٰن میرے ہم جماعت تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا، مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا چنانچہ انہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی۔ اے۔ ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ

ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان ڈپٹی نہیں ہے، اس زمانے میں یہ الف اے میں پہنچے تھے۔

بہرحال اسکیم تیار ہو گئی، اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد اُن سے اظہارِ مطلب کیا، کہنے لگے کہ "بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں" میں نے کہا کہ "میاں عبدالرحمٰن تم اُن تک ہم کو پہنچاؤ اگر ہو سکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت" وہ راضی ہو گئے اور کہا "شام کو آٹھ بجے دوکان پر آ جانا میں مولوی صاحب سے ملوا دونگا" اندھا کیا چاہے .... دو آنکھیں، ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے، یہ دوکان فتحپوری کی مسجد کے قریب تھی جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں، ہم نے جاتے ہی فرشی سلام کیا اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے، سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے، مگر مولوی صاحب یوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا اور کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پتا معلوم نہیں ہوتا، وہ انکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا، سچ ہے "مایوسی انسان کی ہمت کو الا بلا دیتی ہے" "مرتا کیا نہ کرتا" میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اُس پار" مولوی ضیاء الدین صاحب تو بچ کر نکل گئے، لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے، قصہ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں، عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے، کچھ اپنے سلسلے سے خاندانی حالات بھی بیان کیے اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے، میں نے دل میں کہا "ارے یہ تو پہلا جھوا آج نہ ہوا کل ہوا" اب میاں عبدالرحمٰن کو دیکھئے وہ سمجھ گئے کہ اپنا ہے خود کہہ دو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی پہلے ہی قدم پر ناکام با ضابطہ بسپائی عزم

میں نے نہایت رقت آمیز لہجہ میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا، فرمانے لگے "تو عربی چھوڑ دو سائنس پڑھو، بیٹا آج مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے، ہمارے ہاں مثل ہے: پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لوگے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا" اُن کی اس پر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھیرے جامع مسجد کے پیچھے، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون بڑھ سکتا ہے، ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو مسکراتے رہے اسکے بعد کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ داقی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ "یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے، بیٹا جاؤ کسی دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو، دلی میں کیا مولویوں کا کال ہے، مجھے ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا" میں نے عرض کی کہ "جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے۔ مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے ہیں وہ مولوی نہیں ہیں" کہنے لگے "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی جناب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ، اُن کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں" میں نے کہا "ان ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں" کہنے لگے "میں اسکا مطلب نہیں سمجھا" یہاں تو چلتے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا، بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ "بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہئے" ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرض بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں، اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا مگر تم بھاگ جاؤ گے" ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا "نہیں ہرگز نہیں" مولوی صاحب نے کہا کہ "چھٹی ایک دن کی نہ ہوگی" ہم نے کہا

بہت خوب" مولوی صاحب نے کہا "عید بقرعید کو بھی آنا پڑیگا" ہم نے کہا کہ بہت مناسب، کل کس وقت حاضر ہوں" مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے، اس کے بعد کہا "دوپہر کو ڈیڑھ بجے" ہم نے کہا بہت خوب" چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہوگئی تھی اس لئے مولوی صاحب دوکان سے اٹھے، ہم نے سلام کیا اور وہ وعلیکم سلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے یہاں میں یہ ضرور کہونگا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی، ہم دونوں بھی خوش اٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کرکے دوکان سے چلے۔ راستہ میں ہمدانی نے کہا "میاں مرزا! بڑے میاں نے مار ڈالا" گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑی والوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے، دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑیگی، کہاں جاوڑی اور کہاں کھاری باؤلی، جون کا مہینہ کہیں راستہ میں لو لگ کر ٹھنڈے نہ ہو جائیں" میں نے کہا "میاں ہمدانی کچھ دنوں چل کر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے" مگر ان کو آخر تک رحم نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا۔ لیکن انصاف کی بات ہے کہ مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے، بیچاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انہوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا، تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا، یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔

جس طرح ہم نے پڑھایا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے اُس زمانے کے لونڈے ہوں اگر ایسی بِنا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں (پھر میری طرف دیکھ کر) استاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں، تم صرف بی۔ اے پاس کرنے کی فکر میں ہو، وحید کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کریگا، مگر تم کورے کے کورے ہی رہ گئے اور انشاء اللہ پانچ برس میں میری ساری محنت اکارت کر دوگے" خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں میں مولوی صاحب کی شکل و صورت، مکان کی حالت، اُن کے اٹھنے بیٹھنے کے طریقے اور اُنکے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہوسکے، لیکن سٹینو گرافر کا یہ قلم چلانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں، کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ جائے گی، لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ اُن کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی اُن کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی۔ ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھٹھول ملا کے لطیفوں اور واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں اور ایک عالم بیخودی مجھ پر چھا جاتا ہے، مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو، کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو، کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے، دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے انکو ہنسائیں، یہی وجہ تھی کہ ہم اور خاص کر میں، مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے، لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے منقطع اور سست شاگردوں سے نفرت ہے، اس کے بعد بھی اگر

اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو
میرا اس کا صرف یہی جواب ہوگا کہ ع

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنئے۔

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا تھا۔ مگر بڑھاپے نے کمان کو دبا دیا تھا
دوہرا بدن گدرایا ہوا نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق
تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن کے عضلوں کا ڈھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی،
بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا
جاتا تھا، کمر کا گھیر ضرورت سے زیادہ تھا، توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کمر میں ازار بند باندھنا بے
ضرورت ہی نہیں بلکہ تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا، اور صرف ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں
میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے، اسکو بھی ازار سینے کی بجائے دوہرا ڈھر ڈال لیتے تھے
مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو وہ اٹھتے بیٹھتے ہی نہ تھے، اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ
کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، ضرورت نے بہت مجبور کیا تو تہمد
کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اٹھنے کا دبا یا تو نہ پڑا لیتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک
اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ
اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے، ورنہ بالوں کی یہ کگر سفید نقش کی صورت
ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی، آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی
ہوئی تھیں، بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ فگن تھیں، آنکھوں میں غضب کی چمک تھی،
وہ چمک نہیں جو غصے کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی
اور ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری تھی، اگر میں انکو مسکراتی ہوئی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہوگا
کلہ جبڑا نہ بہت زبردست پایا تھا چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے مطالبے سانس کیلئے

گنجائش بڑھادی تھی، اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے
تھے، آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ، کوئی زور سے سُنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب
کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو، جوش
میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے اسی لئے بڑے بڑے جلسوں
پر چھا جاتے تھے، اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف
سنائی دیتا تھا، ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے بھاری، ایسی ناک کو گنواروں کی
اصطلاح میں "گاجر" اور دلّی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے، گو متانت چھو کر
نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی، داڑھی بہت
چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا، کٹے تو کبھی قینچی کے منت کش نہیں
ہوئے، البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کر لیا جاتا تھا، داڑھی کی وضع قدرت نے خود
فرنچ فیشن بنادی تھی، بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی، جیسے
اکس ریز (X Rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز، ٹھوڑی چوڑی اور نکلے
ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی، گردن چھوٹی مگر موٹی تھی، لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد
خانصاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو اسکا بھی حال سن لیجئے، جنہوں نے اسٹیج پر اُن کو
شالی رومال باندھے، کشمیری جبّہ، یا ایل۔ ایل ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انہوں نے
عالیجناب شمس العلماء، مولوی، حافظ، ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ ایل ڈی،
مدظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور
باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا، اگر اُن کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا
تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی، جب شام کو گھر سے نکلتے
تو چھوٹا ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے، گرمیوں میں نہایت صاف ستھرا

سفید اچکن اور سفید کرتہ پیجامہ ہوتا، اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا
جبّہ چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اسلئے لال تری کا سلیم شاہی جوتہ زیادہ
استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لیئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے
جن پر میری یاد میں پالش ہونیکی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک
ہوگئے تھے، انہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا جرابوں
سے ہمیشہ نفرت تھی، گو دربار میں جانے کیلئے دو ایک جوڑیاں پاس ہوتی تھیں، یہ تو پبلک کے
مولوی صاحب ہوئے۔

اب ہمارے مولوی صاحب کے گھر چلیے، آئیے میرے ساتھ چوڑی والوں چلئے چوڑی والوں سے
نکلکر چاوڑی میں آ گئے۔ الٹے ہاتھ کو مڑکر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں سے
گذر کر لال کنویں پہنچے۔ آگے بڑھے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے یہاں سے آگے چل کر نئے بانس
میں آ گئے، یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے نکڑ سے ذرا ادھر ہی اپنے ہاتھ
کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے، بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں
دیکھے، یہاں چاشنی والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں، انہی دکانوں کے بیچ میں سے
ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے تھوڑی ہی دور جاکر بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اس میں
سے کٹ گئی ہے اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے
اور نیا بنا ہوا ہے صفائی کی یہ حالت ہے کہ تنکا پڑا نظر نہیں آتا، دروازے کے باہر
دونوں پہلوؤں میں دو سنگین چوکیاں ہیں، دروازے کو عبور کرنیکے بعد صحن میں آتے ہیں، صحن
کسی قدر چھوٹا ہے، سیدھی طرف فرش ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے کلام مجید پڑھا کیا کرتے
ہیں اسکے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولہے بنے ہوئے ہیں، آگ جل رہی ہے
مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک ہیں سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف
حقہ کیلئے سلگائی جاتی ہے، کھانا دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے، دروازے کے بالکل

سامنے کھپرا دالان ہے، اور اندر ایک لمبا کمرہ، گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی میز کے سامنے کچھ لکھ رہے ہیں، کمرے کے دروازے بند ہیں، ایک کھڑکی باہر ایک بڑھیا پھونس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے، ہاں تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس، مگر خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ کرتا ہے نہ ٹوپی نہ پاجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد ہے جو تام کمر سے بندھی ہوتی ہے، بندھی ہوئی نہیں، محض لپٹی ہوئی ہے، لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے، کمرے میں نہایت اعلیٰ چاندنی کا فرش ہے۔ ایک پلنگ بچھا ہوا ہے، کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے، سرہانے تکیہ کہاں ہے، مگر اس کی رنگت کا بیان حافظہ تحریر سے باہر ہے، البتہ جس گاؤ تکیہ سے مولوی صاحب لگے بیٹھے ہیں، وہ بہت صاف ہے، قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے، اگر مولوی صاحب کی حالت دیکھ کر آپ سوال کر بیٹھیں کہ مولانا "ایں چہ کار است کہ کردہ" تو انشاءاللہ یہی جواب ملیگا کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار"

جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصہ میں رہتے تھے، چلئے وہاں کا رنگ بھی دکھا دوں صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسلخانہ اور بیت الخلا ہے" اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے دروازے سے گذر کے چھت پر آتے ہیں سامنے ہی ایک کمرہ ہے، اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں، غسلخانہ کے بالکل مقابل، دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے آخر آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے، جس زمانہ میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی، یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی سی میز، پہلو میں حقہ، اس کی حقیقت کا حقہ بیان کرنا مشکل ہے، مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا مگر تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی، فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسہ کی دو والی، اور نیچہ تو خدا کی پناہ، اس کے

تیار ہونیکی تاریخ لوگوں کے ذہنوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی، ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا مگر مولوی صاحب نے بیچے کو جورو کا متبادل قرار دیکر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں، سر پر کنٹوپ ہے۔ مگر بڑا اوقیانوسی کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں کبھی اسکے دونوں پاکھے اوپر کی طرف مڑے ہوئے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں، کبھی پاکھوں کے سرے اوپر تلے ڈوریوں سے کس دیا جانا اور اس طرح کنٹوپ فلیٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا۔ جسم پر روئی کی مرزئی مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے مائل بہ سردی ہو چکی ہے اوپر صندلی رنگ کا دھسہ پڑا ہوا۔ بیٹھے دیکھا آپنے ہمارے مولوی صاحب کو؟ چار بجے اور مولوی صاحب نے آواز دی پانی تیار ہے؟ جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے کپڑے بدل (یا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے ٹون ہال کو۔ لیجئے، اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپکے مولوی صاحب ہو گئے۔

گھر میں اس لباس سے استغنا کے کئی باعث تھے، اول تو یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی، پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں انکا سارا دن گذر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے، جسکو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاون ہال کی لائبریری میں جا کر اُن سے مل آتا تھا، جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال، اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں لباس سے استغنا کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے، کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے تھے، اُن کو جس طرح آرام ملتا اسی طرح رہتے، جی چاہا پہنتے، نہ جی چاہتا نہ پہنتے، البتہ جب باہر جاتے تو "کھائے من بھاتا پہنے جگ بھاتا" پر عمل کرتے۔ اصل

عالم تو گھر پر تھے، باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی، یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی، گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کا نوکر نکھٹو بدھو نفر، ان کا نام خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پروا کہ خدا کی پناہ، ظالم نے بہرا بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا، مولوی صاحب کی آواز جس سے مُردے قبر میں چونک پڑیں اسکو کبھی نہ سُنائی دی، اور جب تک کسی نے جا کر اسکا شانہ نہ ہلایا، اس نے ہمیشہ ہی کو اَن سُنی کر دیا۔ البتہ حقہ کے معاملے میں بڑا تیز تھا، یا تو اسکو یہ خیال تھا کہ حقے کے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا مشکل ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے میں اُس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے، غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سلگا بھی نہیں کہ وہ چلم اُٹھا کر چلا۔ مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اُس نے جا چلم الٹ دی، دوسرا سلفہ کہہ، آگ بھر چلم حقہ پر لا کر رکھ دی، تو اگرم، حقہ بھڑک گیا، میاں نوکر صاحب کو پھر بلا کر تو اُٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی، غرض سارے دن انکا یہی کام تھا اور وہ اسی میں بہت خوش اور مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اسقدر پابند تھا کہ لوگ اُسکو دیکھکر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے، بعض یورپ پرست اسکی پابندی اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو کہتا ہوں کہ میں نے صرف دلی میں تین شخص ایسے دیکھے ہیں جو آندھی آئے مینہ آئے، روز آٹھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے، ادھر انہوں نے لائبریری کے دروازے میں قدم رکھا اور اُدھر گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن آٹھ بجائے، لطف یہ ہے کہ اُن میں سے ایک مشرقی میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں، یہ تینوں شخص کون تھے؟ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب، اور تیسرے مولوی صاحب، ایک چیلوں کے

کدھر سے آتا تھا، دوسرا اور یہ سے اور تیسرا کہاری باولی سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو، اگر ان میں سے کوئی نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ نہ آنیوالا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے اور یہ نتیجہ غلط ثابت نہیں ہوا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ، اب آتے ہی ہونگے چھ بجنے میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں، دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں، البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں، انکے اس نظام اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ کچھ تغیر ہو جاتا تھا، وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ گرمیوں میں اٹھتے ہی نہاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتے ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی، باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے، نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا، صبح کی نماز پڑھ کر کچھ تلاوت کرتے، ادھر ذرا دن چڑھا ادھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا، اس جماعت میں بخارا، کابل سرحد وغیرہ کے لوگ تھے ان کی تعداد کوئی ۱۸، ۱۶ تھی محنت ایسی کرتے تھے کہ کوئی دوسرا کرے تو مر جائے، لیکن ٹھوٹھ ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی ان سے تنگ ہو جاتے تھے۔ خوش مذاقی تو انہیں چھو کر نہیں گئی تھی، خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سوء ادبی سمجھتے تھے، اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے یہ یہ لمبی لمبی داڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو، بیچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اتارتے جاتے تھے عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے، لیکن کہا کرتے تھے: "ان فتح پوری سے

ملّانوں کو بڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے، کیا کہوں، میں ہوں ہفوڑا تو ہے منقطع میرا تیرا میل نہیں، کا نقشہ ہے، یہ جماعت الٰہی اور مولوی رحیم بخش صاحب آ نازل ہوئے، کاغذوں کا مٹھا بغل میں، ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، ادھر فتحپوری کی جماعت نے کمرے سے قدم نکالا اُدھر انہوں نے کمرہ میں قدم رکھا اب سلسلۂ تصنیف تالیف شروع ہوا چونکہ آخر آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا۔ اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انہیں سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کیجاتی، اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا، یہ کام بیٹھتے بیٹھتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے، رحیم بخش صاحب کے اٹھتے ہی کھانا آ کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ اِدھر ڈیڑھ بجا اور اُدھر ہم دونوں داخل ہوئے، ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اٹھ بیٹھے، ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزی کرتے رہے۔ اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے، چار بجے اور مولوی صاحب غسلخانے میں گئے، نہائے دھوئے کپڑے پہنکر نکل کھڑے ہوئے، پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھہرے، یہاں بھی اُن کا حساب کتاب تھا، وہاں کا کھاتہ دیکھا، جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہونچ گئے، سات بجے تک وہاں ٹھہرے جس کو ملنا ہوا وہاں مل لیا، سات بجے وہاں سے اٹھ کر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے، یہاں بھی حساب کیا عبدالرحمٰن کو پڑھایا، گھنٹہ بھر یہاں ٹھہر کر مکان پہنچ گئے۔ کھانا کھایا۔ کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے جاڑے میں پروگرام میں بہت تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے، اُس کے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی پھر رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے، ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا، ناشتے اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا، بڑھا جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا، خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا اصلاح کرتے اُن کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے ڈاڑھ میں زیرہ ہو جاتا، البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزہ کا آم ہے" مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ میاں ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے میں نے تو تہیہ کر لیا تھا میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا، کہ مولوی صاحب اگر مجھ سے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم بیچ بیچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں اُن کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا، بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں، پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے، بیٹا تم بھی تجارت کرو، روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا" جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے، گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینہ، قرضداروں کے ہاں انکا روزانہ چکر نہ چھوٹتا تھا گئے اور جاتے ہی پہلے "گلق" پر قبضہ کیا اسکے بعد کھاتہ دیکھا، گردی دیکھی، سامان دیکھ بکری کا اندازہ کیا، روپیہ جیب میں ڈالا سلام علیکم وعلیکم السلام کیا اور چل دیئے دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دُہرایا کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے، اعتراضوں کی بوچھار سے

پریشان کرتے اور کہتے جاتے "دبھئی حساب جو جو بخشش سو سو" فقرے کے پہلے جزو سے تو بیچاروں کو روزانہ واسطہ پڑتا، لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر واقعی بازار کے مندا ہونے یا کسی اور وجہ سے اُن کے کسی قرضدار کا نقصان ہوتا یا دیوالیہ نکل جاتا تو پھر اُس قرضے کا ذکر زبان پر نہ لاتے، انکو خیال تھا کہ دلی کے پنجابی تجارت کو خوب سمجھتے ہیں، اُن کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے، اور اکثر اُن ہی کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک صاحب جنکا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھیڑا، اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپئے کا چک مولوی صاحب نے اُن کے نام لکھدیا، بڑے ٹھاٹھ سے سنہری مسجد کے قریب دوکان کھول گئی، مولوی صاحب جاتے تو گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے دوکاندار صاحب کی چکنی چپڑی باتیں سنتے چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں ڈالنے کو مل جاتے اس لئے خوش خوش بغیر حساب کتاب پوچھے روپئے کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ قصہ مختصر، اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اُس نے دیوالہ نکال دیا، قرقی ہوئی، مال نیلام چڑھا اور اِن میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا، مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی، اسکے بعد آیا، بہت رویا، بہت آنسو بہائے، مولوی صاحب سمجھے بیچارے کو بڑا رنج ہوا، کہا بھئی جاؤ تجارت میں یہی ہوتا ہے، یا اِس پار یا اُس پار، چلو گئی گذری بات ہوئی، ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے کچھ جھٹپٹا ہوا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ دوکاندار صاحب خوب بنے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اُترے اور آ کر ایک گاڑی

گاڑی میں سوار ہوئے، مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے، اتنے میں انہوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا بہت مسکرا کر سلام کیا۔ رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ "یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ" مولوی صاحب کے آگ لگ گئی، دوسرے ہی دن نالش ٹھونک دی اور آخر کار اُن کو ٹھکانے لگا کر دم لیا، لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، انہوں نے خود بھی آ کر بہت کچھ تو بہ تِلّا کی۔ لیکن یہ نہ ماننا تھا نہ مانے اور آخر جب اُس کو کھک کر دیا اُس وقت اُنکو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے۔ مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا اُن کے دل میں تھا، کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا، لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہئے وہ انہوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔

سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اسکا ناطقہ بند کر دیتے، ایک تو حافظ، دوسرے عالم تیسرے لسّان، بھلا اُن سے کون در آسکتا تھا، اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے، واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے، خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے، یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی، آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا، کہنے لگے "کتنا روپیہ چاہیئے" میں نے کہا "بارہ ہزار" بولے "ضمانت" میں نے کہا چوڑی والوں والا مکان، پوچھا کتنی مالیت کا ہے" میں نے کہا کوئی ساٹھ ستر ہزار روپیئے کا" فرمایا "کل قبالہ لیتے آنا" میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا، دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا، پڑھ کر کہا "ٹھیک ہے، مگر بیٹا سود کیا دوگے

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ اور سود" کہنے لگے "کیوں اس میں کیا حرج ہے میں نہ دونگا تو کسی ساہوکار سے لوگے، اُسکو خوشی سے سود دوگے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤگے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا، آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں، میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں، جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جاکر تصفیہ کرآؤ، کل ہی چاک بنگال بنک کے نام لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا "مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہوکر سود لیتے ہیں، اور لیتے ہیں کس سے کہ اپنے شاگردوں سے" کہنے لگے "اسکی پروا نہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا، جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لونگا" میں نے آکر گھر میں ذکر کیا ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سیکڑے پر روپیہ مل گیا، اس لئے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا۔

لیجئے یہ قصّے تو سُنا چکا، اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات جو اُن کی زبانی سُنے تھے بیان کرتا ہوں،

ایک روز مولوی صاحب معلقات پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا　　　وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے کتاب رکھدی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے، ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے، شعر میں تو کوئی ہنسی کی بات نہیں، پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اٹھا ہے، آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی، مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے "میاں بعض شعر قصّہ طلب ہوتے ہیں، یہ شعر میری زندگی کے قصّہ کا آغاز ہے اچھا تو سُناتا ہوں مگر پہلے تمہید

سنو، بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا، تعلیم کا شوق تھا، اس لیے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں آکر ٹھہر گیا، یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے، اُن سے پڑھتا اور توکل پہ گزارہ کرتا، مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے، انہیں بھی پڑھاتے، مجھے بھی پڑھاتے، دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا، تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھ کر میں نے اب پڑھنا شروع کیا، چار برس میں معلقات پڑھنے لگا، گو میری عمر بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا، پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا، صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا، کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی، کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھ دی، کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا، غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا، مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا، اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے، انہیں کے بیٹے ڈپٹی عبدالہادی ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں، اُن کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا، ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا، ادھر اُن کی لڑکی نے ٹانگ لی، جب تک میرا حصہ مجھ سے نہ لے لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی، ندیدی کا ٹکڑا خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی، پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے، جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اُس نے بٹہ انگلیوں پر مارا، بخدا جان سی نکل جاتی تھی، میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انہوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی، چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا، بہرحال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی، تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی، میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں، جب سوچتا ہوں تو پہلا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، اور بے اختیار ہنسی

آجاتی ہے اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا غریق رحمت کرے جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں، اُن کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔ بھئی دیکھنا میں نے بھی بیگم کے مرنے کی تاریخ کہی ہے" اس کے بعد انہوں نے عربی کے چار پانچ اشعار کا قطعہ سُنایا۔ مادۂ تاریخ "لہا غفر" تھا۔ میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی۔ بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے" میں نے عرض کی جی نہیں لیکن اس قطعہ کو سُنکر مجھے دبیر کی ایک رُباعی یاد آگئی، فرماتے ہیں ؎

ہم شانِ نجف نہ عرشِ انور ٹھہرا میزان میں یہ بھاری وہ سبکتر ٹھہرا
اس پلے میں تھا نجف اور اس پلے میں عرش پہنچا وہ فلک پر یہ زمیں پر ٹھہرا

بڑے غور سے سُنتے رہے پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اُس سے یہ رُباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہوگی" میں نے عرض کی کہ آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو متعلق ہو جائیگا، اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے۔ اول تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابل تعریف نہیں ہوتیں دوسرے سر سید کی تاریخ انتقال "غفرلہ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اسکو اپنا مال کر لیا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی، خیر اب اس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصل کہانی کو لو، ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگانے کبھی کبھی کشمیری دروازے کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز جو کشمیری دروازہ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہنچا، قد چھوٹا تھا، لوگوں کی ٹانگوں

میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازہ تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے۔ اُس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک ایک لڑکا آتا ہے اُس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے، یہ مدرسے کے پرنسپل صاحب تھے، ہم تماشے میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لئے اٹھے۔ چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ پر رُکے کھڑے تھے وہ کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی ڈھکیل رہے تھے، غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہو گیا، دروازہ کے سامنے سنگِ مرمر کا فرش تھا، اُس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آ پہنچے تھے، انہوں نے جو مجھے گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اٹھایا اور پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا "میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟" میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا، پھر پوچھا، میں نے پھر وہی جواب دیا، میری عمر پوچھی۔ میں نے کہا "مجھے کیا معلوم" وہ میرا ہاتھ پکڑ، بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھئے تو یہ سچ کہتا ہے یا یونہی باتیں بناتا ہے" مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے" میں نے کہا "معلقات" کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "چچا میاں کے کھڑکے کی مسجد میں" پھر کہا "معلقات دوں، پڑھیگا" میں نے کہا "لائیے" انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھالی میرے ہاتھ میں دی اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انہوں نے انگلی رکھی تھی، وہ یہی شعر تھا ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا — وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنے بیان کیے، انہوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، "میاں واقعی تمہاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور میاں فرحتؔ تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی (مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا، اس کا ذکر آئندہ آئے گا) مفتی صاحب بہت چکرائے، پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے" میں نے کہا مسجد کے مولوی صاحب، کہا "مدرسہ میں پڑھے گا" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھونگا" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اسکو پریسیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا" ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا، کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا، اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنیکی اجازت ہو گئی ہے، کل سے آپ اسکو کالج میں آنیکی ہدایت کر دیجئے اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے، چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھ کو بلایا خط دکھایا، پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، میں نے کچھ جواب دیا جب ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے، اور دوسرے روز لے جا میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس زمانے میں سیّد احمد خاں فارسی کی جماعت میں، مفتی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی سب جماعت والوں کو دبا لیا۔ اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آ جاتا ہے اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں۔ یہ کہتے ہی انہوں نے لہک لہک کر یہ شعر ؎

ابا ہند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا۔

میں نے کہا مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی، کہنے لگے پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی، دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت، دانی نے کہا مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے، مولوی صاحب ہنسے اور کہا میاں انی: ہم پڑھتے تھے، آج کل کے طالب علموں کی طرح چوتڑوں سے گھاس نہیں کاٹتے تھے (مولوی صاحب اس فقرہ کا اکثر استعمال کیا کرتے تھے، معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے،) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے، آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں، آج پڑھا کل بھولے۔ تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی ردّا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے، کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور ارڑا اڑا دھم گری، ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے تھے، پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے، ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آجکل کے عالم محض کاٹھ کے اُلّو ہیں، اچھا بھئی اچھا آگے چلو

بانا نورد الرایات بیضا ✽ ونصدرھن حمراً قد روینا

میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے معنے تو رہ ہی گئے کہنے لگے اتنا بڑا قصہ سُنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے، بس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک مُلّا کا بیٹا ڈاکٹر، ڈپٹی، شمس العلما، ایل ایل ڈی ہو گیا۔ ساتھ آفت کے بیچ اسی دلّی کے، بوجہ اس شعر کے۔

مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سُن چکے، اب ہماری تعلیم کا حال سُنئے، اور قصہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے رُخ سے لیجئے

میں اور میاں فرقانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسے سے آئے کھانا وانا کھایا سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ بیس پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے، دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسرے پر میاں فرقانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا بی چماری رسّی ہاتھ میں لیئے اونگھ رہی تھیں، کبھی کبھی رسّی کو ایک دم جھٹکا دیدیتی تھیں، کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے، لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے، اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا اندر زنانہ تو نہیں ہے غرض اسی شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرے کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا، ہم دونوں اٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا بی چماری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا، کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لئے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے" اس آواز کو پہچانکر ہم تو سنبھل گئے۔ مگر بی چماری اچھل پڑیں، اور بے اختیار ان… کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون ہے" میں نے کہا "میں اور فرقانی" "مولوی صاحب نے کہا آؤ بیٹا، اندر آؤ" مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اس کے بعد کہا "ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا" ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دیدی اور دوسری سے دونوں نے مل کر کام نکالا۔ کیا پڑھایا اور کس طرح پڑھایا، اس کا میں آئندہ ذکر کرونگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا۔ مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ تھا، خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے،

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے، یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلباء کے کان تک پہنچی، وہاں کے ایک طالبعلم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی، وہ آئے ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے" ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو، مولوی صاحب کا کیا بگڑتا ہے، دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا" انہوں نے کہا نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو" ہم نے کہا یار چلو بھی، اگر انہوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ" وہ راضی نہ ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو اس عرصہ میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی، دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا انہوں نے کہا "پہلے کیوں نہ آئے" ہم نے کہا وہ ذرا شرمیلے ہیں، بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے، انہوں نے کہا "طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خیر کل ضرور ساتھ لانا ذرا اُن کا بھی رنگ دیکھ لوں" شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا اور کہدیا کہ بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازے پر دھونی دیے بیٹھے تھے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور کہا "لاؤ کتاب" ہم نے کتاب طاق پر سے اتار اُن کے ہاتھ میں دی اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے، اور کہا "اچھا یہ ہیں میاں رضا" بیچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا بھئی شروع کرو"

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں رانی، اب اسکو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق، ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے، جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج

تم پڑھتے کیوں نہیں، کیا منہ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو، اچھا میاں رضا تم ہی شروع کرو، رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا، اگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر میاں دانی سے زیادہ بنا دیا، ایک دو شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو بھی محبوب ہونے کے شاگرد ملے ہیں، میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے"، رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا "بسر و چشم" مولوی صاحب نے کہا "دیکھو اپنے وعدے سے پھر نہ جانا" انہوں نے کہا "جی نہیں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا" یہ سُنکر وہ بیچارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے، مولوی صاحب نے کہا "بھئی رضا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو میں تم کو ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو، اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمہارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا، بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھرتے دیکھا نہیں جاتا" بیچارے متنبی کو کیا خبر تھی کہ تیاشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں اس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے بیچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے، راستے میں ہم نے انکو بہت بنایا، دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سُن چکے اب ہماری بے حیائی کی داستان سنیئے میری صرف و نحو بہت کمزور تھی، اور کمزور کیوں نہ ہوتی، شروع کئے ہوئے کے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں وقت پڑتی تھی، شعر خود بھی کہتا تھا، دوسروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے

اس لیے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں وافی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے، مگر شعر کو نثر کر دیتے تھے۔ سکتے تو کیا جھٹکے پڑ جاتے تھے، مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جزبز ہوتے تھے۔ ایکدن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی، میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا، مولوی صاحب نے کہا "ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی تمام اعراب بدل کر شعر موزوں کر دیا۔ انہوں نے پھر "پڑھ تو دیے ہوں" کی ہم نے پھر اعراب بدل دیئے، اس سے ذرا کچھ غصہ آ گیا، کہا "وافی تم تو پڑھو" انہوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا، اچھے خاصے چلتے شعر کو نثر بنا دیا، اب کیا تھا، مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا، کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گذر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی، اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ، نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو، اور نہ میں تمہارے پڑھانے کے لائق" وافی نے میری طرف دیکھا، میں نے وافی کی طرف دیکھا، انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "چلو" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا، "ہرگز نہیں" انہوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے، آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے کہ اب جاتے ہو یا نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دیکر نہ نکالے گا۔ اس وقت تک تو ہم جانے نہیں اور جائیں تو پھر ابھی آ جائیں گے" مولوی صاحب نے جو یہ بےحیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے کہنے لگے "اچھا نہیں جاتے تو نہ جاؤ۔ مگر میں تم کو ایک حرف نہ پڑھاؤنگا" میں نے کہا "نہ پڑھائیے مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلینگے" کہنے لگے "بیٹا، اس وقت میری طبیعت خراب ہو گئی ہے، اب چلے جاؤ کل آ جانا" وافی نے [illegible]، میں سمجھا

اس وقت اٹھے مولوی صاحب ہاتھ سے گئے، دوائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے پکڑ کر اُن کو بٹھا لیا۔ مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے اور آج پڑھیں گے تو اسی وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھا دیجئے۔ ورنہ ہم یہاں سے نہ جانا ہے نہ جائیں گے" آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے۔ کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے، تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہ ہوں گے شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا، اچھا خدا کے لئے کتاب اٹھا لاؤ، اور سبق پڑھ کر میرا پنڈ چھوڑو، دیکھئے کونسا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے" میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے، کہا کرتے تھے کہ اگر اس وقت تم .... ٹل جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمہارے شوق کو آزماتا تھا، مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا، خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے، یہ بیجا بھی نہیں میاں یہ شوق ہے۔ علم کا جسکو چسکا ہوتا ہے وہ بُری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے بے شوق بھاگ نکلتے ہیں اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں،

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب الٹ کر میز پر رکھ دی۔ پہلے دوائی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف و نحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا "آپ مہربانی کر کے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے"، اس کے بعد معنی بیان کئے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ چھیڑا۔ اب میاں دوائی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے یوں ہی ہزاروں شعر یاد تھے، دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا، مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے

تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا، غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکتے تو یورپ اور انگلستان کے شعراء اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا۔ اس میں ان کی بھی شرکت ہو جاتی تھی، اگر کوئی شعر قصہ طلب ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گذرا تھا تو اس قصے کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے، غرض ایک شعر کی تشریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا تھا، مگر اس کے بعد جو وہ شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا، چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں، اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلہ میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ غدر کے زمانے میں دہلی پر اس طوفان بے تمیزی میں گذری تھی اس کی داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے۔ اکثر کہا کرتے تھے، میاں بیچارا بادشاہ مجبور تھا، کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی اٹھے تھے، ان کا مقصد تو شہر کا لوٹنا تھا وہ پورا ہوا اور انہوں نے دہلی کو پھونک کر دیا، ایک روز میں دریبہ میں سے جا رہا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آرہی ہے، میں بھی یہ دیکھ کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے، مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے، مگر ان کی عجب کیفیت تھی، گھوڑے کیا تھے ٹٹو یا گدھے معلوم ہوتے تھے، بیچ میں سوار تھے، گٹھڑیوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھڑیاں کیا تھیں، دہلی کی لوٹ تھا جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لئے، جس روپیہ پیسے والوں کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر ڈھئی دیدی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو، تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے، جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے بیچارو

لیکن انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے
غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا دین دین کے نعرے مارتا میرے سامنے
سے گزرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولہا میاں تھے۔ یہ کون تھے؟ عالیجناب
بہادر خاں صاحب سپہ سالار۔ لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہا معلوم
ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم
کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ،
صافے پر بجائے طرے کے سرا سہری لگائی تھی، جیسے خود زیور سے آراستہ
تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے
جاتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان ہی کے ہاتھ آگئی ہے
گلاب گندھی نے جو ان لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی اور
اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا
عین اوس کی دوکان کے سامنے آکر رکا، بہادر خاں نے ادھر ادھر گردن پھیری
پوچھا یہ کس کی دوکان ہے،، ان کے ایڈیکانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی
کی، فرمایا اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ بادولت ادھر سے گذر رہے ہیں دوکان
بند کرنے کے کیا معنی، ابھی کھلواؤ، خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بچارے لالہ جی
پر اندر کیا اثر ہوا، ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر
مار کر کہا کہ دروازہ کھولو، اور جس طرح ،،سمسم کھل جا،، کے الفاظ سے علی بابا کے
وقت میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس حکم محکم سے
گلاب گندھی کی دوکان کھل گئی یہ جسم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تلنگے کا پردہ
اٹھ گیا۔ دروازہ کے بیچوں بیچ لالہ جی ہانپتے کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے
تھے، کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یاری نہ دیتی تھی، اس وقت بہادر خاں

کچھ خوش خوش تھے، کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے ہونگے۔ کہنے لگے تمہاری ہی دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے؟ لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو، وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے، معلوم نہیں بیس روپیے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپیہ تولہ کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنٹر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرا دی دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں، عطر سونگھا، کچھ پسند آیا، ایک کنٹر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دم پر۔ کنٹر پھینک حکم دیا گیا "فارورڈ"، اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپئے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے، ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا، بچارے لالہ جی نے گھبرا کے دوکان بند کر دی، بھئی غدر کے طوفان بے تمیزی میں نقصان تو جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی، پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کے نذر کی ہے۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی وقت سے تیار ہوا تھا، اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ غرض یہ کہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی، دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے غدر کے زمانہ میں کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی، اس نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری

دروازے سے آکر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے، یہ سننا تھا کہ ساری فوج کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا، سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشے پر مارا، چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی، ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین کی دوربین اٹھا نیچے پھینک دی، اور چند ہی منٹ میں دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا،

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں۔ لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کا زمانہ موجودہ میں دہرانا خطرناک ہے، اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے، ہم بی اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے جو کچھ لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا، میں نے اس مضمون میں ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا، میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لیے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے۔ اب وہ مضمون دریا برد نہیں تو دریا پار ضرور ہو گیا، مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے، اس لیئے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال

بھی سن لیجیے، اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار ہی کے لوگ تھے۔ لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں، ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، شملہ بقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی داڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر پاشنوں کی گلی میں رکھ دیا گیا ہے، محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے، گھوٹتے، ایسے کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے، مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے "بھئی میں ان ملاؤں سے عاجز آگیا ہوں، اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں اور میرا بھی، جواب اس لیے نہیں دے دیتا کہ دل شکنی ہوگی، مگر کیا کروں، اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا، بھلا ان کو حماسہ یا متنبی پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے، فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں، یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں۔" ہم کہتے مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں رگڑ سے پتھر بھی گھس جاتا ہے، آخر متنبی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں" ایک روز فرمانے لگے "لو آج تم ٹھیر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا، ورنہ چھری پھونک دیں گے۔" اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی، ہم پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی، یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے، اور ہم اٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھے۔ اس روز مقامات حریری کا سبق تھا، کتابیں کھولی گئیں اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں آعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن حارث کے سفر کا حال تھا، اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اناء اللیل" سے ادا کیا تھا، ان بھلے آدمیوں نے

رلت کو قاموس دیکھ کر مطالعہ کیا تھا، انہیں شامت اعمال سے "آناء" کے معنی "ٹھکے" کے بھی ہیں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ انہوں نے یہاں ٹھکا پھنسا دیا اور نہایت متانت سے "فی آناء اللیل" کے معنی "رات کے ٹھکے میں سفر کیا" کے کر دیئے" مولوی صاحب نے فرمایا "آناء کے دوسرے معنی بھی تو ہیں" پڑھنے والے نے کہا "جی ہاں کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پر ٹھکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے" ہم کو ہنسی آئی، مولوی صاحب نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا، ہم نے سوچا بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں، یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے، کہیں کوئی اٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے ہم نے اجازت چاہی مولوی صاحب کہتے ہی رہے "بیٹھو ذرا اور کچھ سن جاؤ" ہم نے کہا "مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائیگا" یہہ کہہ جوتیاں پہن سر پر پاؤں رکھکر بھاگے، کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع کیا گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی، اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے اور رات کے ٹھکے میں سفر کرنے کا فقرہ ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجہ میں کیا کرتے تھے، اردو ادب میں انکی جن تصنیفات نے دھوم مچا دی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی چیزیں تھیں، وہ کہا کرتے تھے کہ "میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اسکا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں، ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے، میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے" ہم نے کہا "مولوی صاحب بٹھایا! نہیں ٹھونسا ہے" جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل پڑے، بڑے خفا ہوتے اور کہتے "کل کے لونڈے میرے محاوروں کو غلط بتلاتے ہو، میاں میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر

بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو جیسیں بول جاؤ گے" محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے اُن کا جھگڑا ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ کہا کرتا تھا "مولوی صاحب آپ نے محاوروں کی کوئی فہرست تیار کر لی ہے اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ ٹھونسا دینا چاہتے ہیں، خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو، جناب دلّی والا اہلِ زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے، یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں۔ تھوڑی دیر تو حجت کرتے، اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی، ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو، مگر میاں اپنا ہی نقصان کرو گے۔"

مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اول تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے، دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے، لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونس ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے، اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے، خدا معلوم انہوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا کہ ایسے ایسے محاورے اُن کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستہ میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے، پہاڑ کھڑے کر دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں، بہر حال ان کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے، اور اس کی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے

ترجمہ کرنے کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اگر اُس زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھدیا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اسکا ترجمہ مولوی صاحب کے سپرد ہوا۔ ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی جلد کی ایک بڑی موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے ہم نے اجازت لیکر کتاب اٹھائی اور اول سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں، اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے "بیٹا یوں سرسری نظر سے کیا دیکھتے ہو گھر لے جاؤ، اچھی طرح پڑھو، مگر دیکھو خراب نہ کرنا" ہم دونوں نے دلمیں سوچا کہ خدا معلوم یہ کیا بھید ہے جو مولوی صاحب بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں خوش خوش کتاب بغل میں مار گھر آئے، دو ایک دن میں پڑھ ڈالا، ایک آدھ تصویر بھی غائب کر دی، چوتھے روز کتاب لے جا مولوی صاحب کے حوالہ کی "پوچھا" کہو پسند آئی" ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے، "کہنے لگے" اچھی کتاب ہے تو ترجمہ کر ڈالو" ہم نے کورا جواب دیدیا۔ کہا دیکھو، سنو، اس کتاب کا مجھے ترجمہ کرنا ہے، تم سے ترجمہ کراؤنگا صحیح میں کر دونگا اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں، اگر آپ نے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دونگا۔ یہ کہتے کہتے کتاب کی جلد توڑ دس صفحے میرے اور دس میاں وفی کے حوالہ کر دیئے، ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی اور وہ آئے اُن کو حکم دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دیدو، قہر درویش بر جان درویش کی صورت تھی، جس طرح پہلے خوشی خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منہ بنائے ہوئے ان پلندوں کو بغل میں مارا۔ گھر آکر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا، دوسرے روز جا کر پڑھنے کے لئے کتاب اٹھائی، پوچھا "ترجمہ لائے"، ہم نے دبی ہوئی آواز

کہا۔ لائیے" کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھ کر اُس کی درستی کرتے جاتے۔ اب اگر میں یا میاں نانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانیئے کہ دونوں جھوٹے ہیں، مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہوگئی اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی۔ کیونکہ بندہ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا، اگر کچھ پروا نہیں، اس کا بدلہ ہم اب لیئے لیتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کانٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے اس لیئے اُن کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ اپنے مطلب کے لئے ضرور مل جاتا تھا، مثلاً اسی جشن تاجپوشی کی کتاب میں ایک جگہ (STALLION) آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اُس کے معنے "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیئے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو بہت ہنسے کہنے لگے" واہ بیٹا، واہ، کیوں نہ ہو دلی والے ہو، خالص اردو لکھی ہے، بندۂ خدا "شبدیز" لکھ دو چلو چھٹی ہوئی" اب کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا، سینکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے، دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہوگئے

لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے، ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں ہوا کہا کرتے تھے کہ تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا، ان میں ایک مولوی عظمت اللہ صاحب اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی، اور ہم ڈائرکٹر صاحب کے سررشتہ دار تھے روز آنہ ایک دو دفعات کا ترجمہ آتا۔ ہم ڈائرکٹر صاحب کو سناتے،، وہ بڑا غل مچاتے کہ "یہ لفظ خلاف محاورہ ہے اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے۔" غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں، مجھے بڑا تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی یہ باتیں سنے کوئی، مگر بھئی یہ ضرور کہونگا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا وہ ان تولے پاؤرتی کی کہتا تھا جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا، میاں پرانے زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے۔ گو اچھی اردو لکھ نہ سکیں، مگر ترجمہ کی وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دلی والوں کے کان پکڑوا دیں، میں بھی ترجمہ دیکھا تو واقعی کچھ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا، میں نے دل میں کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا، اردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، عربی جانتا ہے، کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کرے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا، رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ باندھ، ترجمہ پر پل پڑا، جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونیوالا تھا ان کا ترجمہ خود کر ڈالا۔ دوسرے دن ترجمہ جیب میں ڈال دفتر پہنچا ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور ان لوگوں کے ترجمہ کو سنکر وہی گڑبڑ شروع کی خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی، میں نے کہا کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے کہا، اچھا کہو۔ میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا وہ سمجھے عرضی ہے لینے کو ہاتھ بڑھایا

میں نے کہا، عرضی نہیں ہے، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا ہے" ڈائرکٹر صاحب یہ سنکر اچھل پڑے، کہنے لگے "تم نے، تم نے ترجمہ کیا ہے، تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا، میں نے کہا رائل ڈکشنری سے انہوں نے سنکر کہا "تعزیرات کا ترجمہ رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا" میں نے کہا "سن تو لیجئے" کہا "اچھا سناؤ" میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں" کہنے لگے یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے، میں نے کہا "ہاں" کہنے لگے کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کر کے لاؤ" میں دوسرے دن لیکر گیا۔ بہت پسند کیا اور کہا "تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا کہ میں ترجمہ کر سکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا جاؤ تم بھی اُن ترجمہ کرنیوالوں میں شریک ہوجاؤ" اُس دن سے ہم بھی پانچوں سواروں میں مل گئے، اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ ایک ہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپّر پھاڑ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ مراۃ العروس پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا، اصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی، وہی پڑھا کرتی تھی میاں بشیر کو "چندپند" لکھدی تھی۔ میں اس زمانہ میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلے تھے، بال بچے ساتھ تھے، ایک جگہ ٹھہرے تھے کہ مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب آ لگا۔ شام کا وقت تھا۔ میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے۔ اُدھر ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے، میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھہر گئے، پوچھا "میاں تمہارا کیا نام ہے" انہوں نے نام بتایا، پھر پوچھا تمہارے والد کون ہیں" انہوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو" انہوں نے کہا "چندپند" کا نام سنکر پریشان ہوئے۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے اُن کے کان نا آشنا تھے کہا ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے، بشیر نے کہا۔ جی ہاں ابھی لاتا ہوں، ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھیئے گا" انہوں نے کہا "اُس کتاب کا

کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا "مرآۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا، صاحب نے
کہا ہاں وہ بھی لاؤ" میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے، اپنا
جزدان کھول "چند پند" نکالی اُس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا، اُس نے
جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی، اتنے میں بشیر مرآۃ العروس
لے کر بھاگا، یہ اسکے پیچھے بھاگی دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی، خوب رونا
پیٹنا ہوا، بشیر بہن کو دھکا دے کتاب لے یہ جا وہ جا، بہن صاحبہ نے دل کا بخار
آنسو بہا کر نکالا، میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا صاحب کے حوالہ کیں۔ انہوں
نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لے جائیں گے، کل بھجوا
دیں گے،" انہوں نے کہا لے جائیے، کل ہم کو چھٹی رہیگی" میں جو ڈیرے میں آیا تو
کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے، لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کرلی ہیں،
میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں میرا اندر قدم رکھنا تھا
کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی، صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح
کسی عزیز کے مرنیکا کوئی بین کرتا ہے، میں نے بشیر کو بلایا، وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی
نہ ہو جائے، پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا، وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی
تھی آخر بڑی مشکل سے اتنا معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا، میں
نے جاکر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا، تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے میں پڑے
ہیں اُن میں وہ اترے ہیں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں
سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دوں گا، نہیں تو دوسری منگا دونگا۔ اُس
نے کہا کہ میں تو وہی کتاب لونگی، بڑی مشکل سے اسکا غصہ ٹھنڈا کیا اب فکر ہوا
کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح
بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے، غرض اسی شش و پنج میں صبح ہوگئی

کوئی سات بجے ہونگے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں۔ میں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مراۃ العروس پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں اگر کل آپ کا پارہ کا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی بھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں اگر آپ اجازت دیں تو میں مراۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں میں نے کہا آپ کو اختیار ہے" یہ کہہ کر میں چلا آیا، صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی، وہاں سے انعام ملا، یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا، اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں، جو کتاب لکھی اس پر انعام ملا جو لکھا پسند کیا گیا۔ غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ساتھ ہی، ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا عہدہ جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اسکی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے یہی مصیبت ہم پر پڑی ادھر کام کی زیادتی، ادھر سرسید کی فرمائشوں کی بھرمار، آج یہاں بھیج دیا، کل وہاں [illegible] تصنیف کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا، خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا، اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کرو، لوگوں کو بھی مفید ہوگا، اور شاید تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے، غرض جتنی محنت ممکن تھی اتنی محنت کی، اسی ترجمے کے سلسلے میں "الحقوق والفرائض" کا مواد بھی جمع کر لیا، کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک پنتھ اور کئی کاج ہو گئے، مگر بھئی سچ کہنا کیسا ترجمہ کیا ہے" میں تو خاموش رہا مگر واقی نے کہا کہ مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں میاں واقی! یہ کیا کہا، تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا، ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ جو سنہری

جاؤ، یہ شمائل شریف ہے وہ میاں وانی کو دیدو۔ بیٹیا ذرا اسکو غور سے پڑھو دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے" غرض شمائل شریف میاں وانی کے قبضہ میں آ گئی، انہوں نے شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی، جب ہم اٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے وانی سے کہا۔ "ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا، اس شمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپیہ ہے کل ضرور لیتے آنا، بچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز پورے ساڑھے پانچ روپیہ مولوی صاحب نے دھروا لیئے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کئے، لیکن یہ برابر کا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا یہ نہیں کہ خدانخوا وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا۔ میں اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ "اچھا بھئی" تو یوں ہی لے جا مگر میرا پیچھا چھوڑ" میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا، مولوی صاحب قیمت مانگتے، میں حجت کرتا، وہ جواب دیتے میں اس کا جواب دیتا۔ غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا، مگر خدا غریق رحمت کرے کوئی نہ کوئی کتاب مجھ کو دے دیتے تھے اور جان جان کر جھگڑتے تھے، ریویو کے لئے جو کتابیں آتیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں، وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا اس وقت بھی میرے پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں، معلوم نہیں کہ میاں وانی کو جو شمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ ان کے پاس رہی یا نہیں، کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل ایل ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کا فکر کیا تھا ہوا یہ کہ جب میں اور وانی بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا، گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں۔

والی کو تو گون مل گئی، میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی، ہم دونوں مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کہنے لگے، "وہ بیٹا! میری گون بڑی قیمتی ہے، ساڑھے چھ سو روپے میں دو گونیں پڑی ہیں، بھلا کیا خریدتا، یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں، وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھوا کر بھجوا دیجئے۔ سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں، سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے، مجھ پر بھی بہت مہربان تھے، میں نے مشرف کے لکھنے کو سچ جانا، کتابوں کی جلد بندھوا ایڈنبرا روانہ کر دیں، ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ تھا۔ وہ بہت پسند کیا گیا سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں، اور ہمیں گھر بیٹھے ایل ایل ڈی کی ڈگری مل گئی، مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی، پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون مع ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم حسب قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپیہ روانہ فرمائیے، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے، یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا بنڈل بھی آ گیا، غرض اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا، دوسری ڈاک سے ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا، قہر درویش بر جان درویش، درزی صاحب کو رقم روانہ کی، مشرف کو بڑا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ چیتھڑے بنوا کر بھجوانے کیا ضرور تھے۔ میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا بہر حال یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپے کی ہیں، معاف کیجئے، نہیں دے سکتا، جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا۔" جو میرے پیچھے پڑا ہے میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا، اس کے بعد بغیر کچھ

کہیے سننے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رخ کیا۔ وہ "ہاں ہاں" کہتے ہی رہے میں نے کنڈی کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی، جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اٹھے، میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آ گیا مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے، اور اب انہوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات، بی، اے اور ایل۔ ایل ڈی کی گون کے اختلاف، غرض اسی طرح بیسوں چیزوں پر لکچر دے ڈالا، مگر میں بیٹھا سنتا رہا جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا، استادوں کی غیبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت، وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوں پر میں نے بھی اسپیچ دیدی، اور آخر میں صاف کہدیا کہ یہ گون میں لیکر جاؤنگا، اور ضرور لے کر جاؤنگا اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے "واپس کب کروگے" میں نے کہا آپ سرخ گون پہنتے ہیں، کالی گون مجھے دیدیجئے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائیگا" مولوی صاحب نے کہا "نہیں میاں لاہور سے آکر دیدیجیو، مجھے، دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے" یہ الفاظ انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ کرتے ہی بن پڑی، آخر میں گون لے کر گیا اور لاہور سے آکر واپس کردی، جب مولوی صاحب نے گون پر قبضہ کر لیا، اس وقت بہت خفا ہوئے، کہنے لگے "اچھے تو اگر میری کوٹھری میں گھسا تو اچھا ہی نہ ہوگا، کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائیگا، خیر وہ اپنی گون لے جاتا تو کچھ حرج نہ تھا، کیونکہ واپسی کی تو امید رہتی، مجھے کب امید تھی آپ بزرگ واپس بھی کریں گے وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا، جو واپس آگیا" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی

تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے، ہنس کر کہنے لگے "چار مشتے بعد از جنگ کی صورت ہے آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا" اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں، مگر اب افسوس ہوتا ہے، گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار رہتی، کیا ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھیجدے۔ کیونکہ اس میں میرا بھی حق ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی، لیکن وہ سمجھ چکے تھے، یہ میرے ہاتھ سے گئی میری غلطی تھی جو اسکو لے جاکر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کرونگا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گون مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں، اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدرآباد میں فرنیچر اُن کے سر چیپک دیا تھا۔ اُس زمانہ میں حیدرآباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا، اُن کی تجویز اور سرسید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدرآباد آئے، پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا، اُس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے ہندوستانی وضع کا سامان تخت چوکیاں وغیرہ خریدیں، بھلا محسن الملک یہ کیونکر دیکھ سکتے تھے کہ اُن کا دوست پرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے، ایک روز سکندرآباد جا ایلن اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر دیدیا اور کہدیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو، اور بل بنا کر بھیجدو، ایک روز جو مولوی صاحب اٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر چھکڑا فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے، بہت بگڑ اٹھے لینے سے انکار کیا، مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا جن تھا، وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے، اور دن بھر میں مولوی صاحب کا مکان جہانگیر بہادر کی کوٹھی ہو گیا، مگر یہ بھی نذیر احمد صاحب تھے، کچھ ایسی چال چلے کہ جب اُن کا تقرر ننیجرو کی صدر تعلقداری پر ہوا تو وہ سب کا سب سامان بہت ہی

تھوڑی کمی پر ایلن کے سر مارا، اور فرنیچر وہی اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے۔ نواب محسن الملک کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے، نواب محسن الملک دورہ پر نکلے، فرنیچر قیام کیا۔ مولوی صاحب خود کہیں دورے پر گئے ہوئے تھے، نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ میں آیا ہوں میرے قیام کا انتظام کر دو، ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں ایک دو میزیں تھیں کھولدیا گیا۔ وہ ایلن والے فرنیچر کی تلاش میں تھے۔ سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھا ہوگا۔ اندر کہلا بھجوایا کہ میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیرونگا، پہلے تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی، مگر جب ادھر سے اصرار ہوا تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفاچٹ میدان ہے، نہ دری ہے نہ چاندنی، نہ میز ہے نہ کرسی، کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تخت ہے اس پر ایک کمبل پڑا ہوا ہے، بازو میں ایک چوکی پر رحل اور جانماز رکھی ہے۔ کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے۔ یہ بہت چکرائے، لوگوں سے پوچھا وہ "فرنیچر کہاں گیا،" معلوم ہوا کہ آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کرآئے، بچارے ایک رات ٹھیرے اور صبح ہی کوچ بولدیا،،

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور ان کی نبی رہی، بعد میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی، مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہوکر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔ غرض جب عماد السلطنت بہادر کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب معلوم ہوا۔ دوسرے حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات مولوی صاحب

بیان کیا کرتے تھے، اُن کا زبانِ قلم پر نہ آنا ہی زیادہ مناسب ہے، بعد میں دونوں بظاہر ملتے جلتے تھے، لیکن موقعہ پڑا تو ایک دوسرے کو پرُدے ہی پرُدے میں سُنائے بغیر نہ رہتے تھے ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء کے دربار کے موقعہ پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ہوا، اُس زمانہ میں نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکرٹری تھے، کانفرنس کے صدر ہز ہائینس سر آغا خاں تھے آدمیوں کی یہ کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ تھی، ہر جلسہ میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے، ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کیلئے مقرر ہوا تھا۔ مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا اُس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دینگے خلقت ٹوٹ پڑی، لکچر شروع ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤنگا نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت و ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں، مولوی صاحب کے لکچر میں اِس سے خلل پڑتی تھی پنڈال کے باہر گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے، اٹھ کر باہر جاتے اور باہر اور پھر آ بیٹھتے اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے، مولوی صاحب بہت جز بز ہوئے خفا بھی ہوئے مگر ان کی کون سنتا تھا، قصہ مختصر یہ کہ لارڈ کچنر آ ہی گئے نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا، مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کر لیا لارڈ کچنر کہنے لگے "مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" مولوی صاحب نے کہا "لاٹ صاحب مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہو گیا لارڈ کچنر نے کہا وہ کیا معمہ تھا؟" مولوی صاحب نے کہا "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دے گی، مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے، جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دیے

تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرادے تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا کہہ گئے، اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید و شاید، چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقر عید کے دن دہلی میں تھے، اُس روز جمعہ تھا صبح کو بقر عید کی نماز عید گاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا، اس دربار میں آٹھ یا ۹ دہلی کے ہندو امرا اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے، سر ہنری میک موہن نے اُن لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا، جب مولوی صاحب کی باری آئی اور انکی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا آپکو ان کی تعریف کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود انکی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کرا چکا ہوں، دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا، اُسکے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا، آپ شعر بھی کہتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں، لیکن آج آپکی تعریف میں اپنا نہیں دوسرے کا شعر سناؤنگا، یہ کہکر متنبی کا یہ شعر پڑھا ؎

عید و عید و عید مجتمعًا   وجہ الحبیب و یوم العید و الجمعا

موقعہ کے لحاظ سے یہ ایسا برمحل ہوگیا کہ متنبی کو تصنیف بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاص کر حبیب کے لفظ نے شعر میں جان ڈالدی تمام دربار چہک اٹھا امیر حبیب اللہ خاں نے اٹھکر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا، اور اتنے بوسے لئے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے، دوسرے روز جو انہوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اسکو انہیں کے الفاظ میں دہرانا اچھا معلوم ہوتا ہے کہنے لگے، بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا، اس شیر کا کوئی سوا گز

چوڑا سینہ، میں ٹھہرا چھوٹے قد کا آدمی، اُس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پسلیاں ہونے لگیں ادھر دم گھٹنے لگا اسکی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں جنبش تک نہیں ہوتی قسم خدا اسوقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے، بارے خدا خدا کرکے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں فوراً علیحدہ ہوا ابھی اچھی طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اُس نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال بوسے پر بوسہ لینا شروع کیا بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے، وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہکر پھر لپٹ جاتا، لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسہ پر بوسہ لینا شروع کرتا بیچارے دوسرے بیٹھے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہونگے، جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے، نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی سے سلام ہے، کون شعر پڑھ کر اپنی ہڈیاں تڑوائے مولوی صاحب اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے، مگر اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جا رہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی

اس تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی جو کہنا ہوتا تھا وہ بغیر کہے نہ رہتے تھے، اسمیں کیسی گورنمنٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا اور اس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اسوقت تک ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا، اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بڑا غصہ آیا خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند ہی روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا اور لارڈ لیفرائے ہندوستان کے لاٹ پادری تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انہوں نے اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لارڈ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے۔ اب کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے، جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا، خوب اچھی طرح نکال لیا، کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے

مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات، مگر انہوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی خاموش نہیں ہوئے سب سے پہلے انہوں نے ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پُر مذاق پہلو سے بیان کیا، فرمانے لگے "حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون، ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے۔ مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے اس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے، ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔ یہ کیوں؟ اسلئے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہم جُتی سلیم شاہی جوتی پر جان دینگے کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم نرم اور سبک ہوتی ہے ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے۔ یہ کیوں؟ اسلئے کہ انگریزوں کا پہناوا ہے، ہمارے پاس ہر نئی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونیکا ثبوت موجود ہے۔ اُن کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں، اور بھئی سچ بھی یہی بات، قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغ ہدایت، اب افعال سے گذر کر اقوال پر نوبت آگئی ہے، پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑ دو، اور انگریزی سچ بولا کرو، آج ہمارے پادری لیفرائے بھی اُن کے ہمنوا ہوئے ہیں یا تو انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آگیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینکا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے۔ یا اُن کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال وسادر ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اب تمہارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے خدا کے لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو اُن لاٹ صاحبوں کا حکم مانو، یہ بڑے لوگ ہیں

مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انہوں نے ہندوستانی سیج بولنے
کی ہدایت کی اور تم نے ہنس کر ٹال دیا، لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سیج کو
اور بہ انداز عال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائیگی، اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں
کو محتاج ہو جاؤ گے۔ کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا
خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے دلدر دور ہونگے

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا، لاٹ صاحب
اردو بہت اچھی جانتے تھے، مولوی صاحب کی اس پرمذاق تقریر پر مسکراتے رہے۔ مگر
دل کا خدا ہی مالک تھا، کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مگر یہاں
تیر از کمان جستہ کی صورت تھی، کیا کر سکتے تھے، البتہ دل میں انہوں نے ٹھان لی ہوگی
کہ آئندہ مولوی صاحب کو .... شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی
مناسب ہے،

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدرآباد چلا آیا۔ پھر دو دفعہ دہلی میں مولوی
صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ امہات الامہ کی وجہ سے مولوی
صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا، کہنے لگے "بھئی مجھے تو اس
کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں، تم نے
بھی یہ کتاب دیکھی ہوگی، آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میں نے کونسی ایسی نئی بات لکھی ہے"
میں خود امہات الامہ نہیں دیکھی تھی۔ مگر میں مولوی صاحب کے طرز تحریر سے
واقف تھا اس لئے میں نے یہی کہا کہ "مولوی صاحب آپ کا طرز تحریر مذاق کا
پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے تاریخ کی کتابوں اور
خاص کر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا، اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو آپ کی
طرز تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔ مولوی صاحب نے کہا "میرے کلام مجید کے ترجمے کے

متعلق تو یہ اُن کو ہم نہیں سمجھا۔ میں نے کہا، پھر بھی لوگوں کو اعتراض ہیں، مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے، اور یہاں انسانوں سے، مشہور مقولہ ہے کہ

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے "ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو۔ اس قسم کی تالیفات میرے دائرۂ تحریر سے باہر ہیں، انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو رفع کر دوں گا۔" جب میں چلنے لگا تو فرمایا "کہو بیٹا پھر ملو گے، ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں۔" میں نے کہا "انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔" ہنس کر کہنے لگے "انشاء اللہ کہنے کے بعد تم ضرور آ چکے۔ مسلمانوں کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزار دل چاہے کہا کرتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ انشاء اللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اس کے یہ معنے سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کر لیں گے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کو انشاء اللہ کے یہ معنے بنانے مناسب نہیں ہیں۔ آپ مذاق پہلو مذہبی معاملات میں بھی نہیں چھوڑتے۔" کہنے لگے "میاں پہلے انشاء اللہ کے معنے دوسرے تھے، آج کل کے مسلمان وہی معنے لیتے ہیں جو میں نے بیان کئے۔" خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا۔ اور صبح ہی کے میل سے میں دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آ کر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا، اسی میں رہتے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہو گیا تھا، آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازہ میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے "ہیں یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے کہا "میں ہوں" پھر پوچھا "آخر میں کون صاحب ہوئے؟ نام کیوں نہیں بتاتے؟" "اے بھئی اب مجھے

صاف نہیں دکھائی دیتا ذرا قریب آؤ۔ میں نے کہا "واہ مولوی صاحب واہ" "اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا، دور سے پہچانتے تو بات ہے" ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "اوہو میاں فرحت ہیں" بھلا اور کون ہے جو ایسی باتیں کریگا۔" تو بیٹے ابکے تو کئی برس کے بعد آئے"۔ میں پاس گیا گلے لگایا حالات پوچھتے رہے باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے"۔ میں نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ "ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں" کہنے لگے "اوہو دیر ہو گئی" "ذرا میرا جوتا ادھر دینا" میں جوتا اٹھا لایا میں نے لاکر جرابیں پہنائیں جوتا سوکھ کر اکڑ ہو گیا تھا، وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونس لیا جوتا پہن کھڑے ہو گئے میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی اور ٹوپی دی، وہ پہن کر کہنے لگے "چلو بھئی وقت تنگ ہو گیا ہے"۔ میں نے کہا مولوی صاحب آخر کہاں جا رہے ہیں، کہنے لگے "بیٹا آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے" "وہاں جا رہا ہوں" "ذرا مجھ کو کشمیری دروازے تک تو لے چل" میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں، میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجئے، خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، آخر یہ کس دن کے لئے ہے، روپیہ اسی لئے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے" بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے، پھر کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، ذرا اپنی حالت کو دیکھئے، اور کشمیری دروازے کو دیکھئے، یہ دو میل جانا اور دو میل آنا آپ کو مضمحل کر دیگا۔ ذرا ٹھہر جائیے، میں گاڑی لے آتا ہوں"۔ بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اب جاتا ہے تو چل نہیں تو میں کسی اور کو بلاتا ہوں، ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازے تک نہ جا سکوں"۔ میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب تو گاڑی رکھ لیجئے، اگر آپ خرچ نہیں اٹھاتے تو میں اٹھاؤں گا" ہنس کر کہنے لگے "کیوں نہ ہو روپیہ اچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ

گاڑی نہ رکھہ سکوں بیٹا بات یہہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لئے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا، ایک تو دانا گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے، تیسرے گاڑی کا آج یہہ توڑا کل وہ توڑا، کون بیٹھے بیٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے، رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہوگئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں، نا بھئی نا، اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے" میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرا لیا ہوتا" کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے ہمیشہ کچہری میں جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضعداری کو کیوں چھوڑ دوں" بہر حال یہی حجت کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی انہوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بیٹھایا اور سب سے پہلے انہیں کا مقدمہ لیکر ان کی شہادت قلمبند کی، اور یہہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدرآباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں اندر قدم نہیں رکھتا مگر باہر ٹھیری پر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں، اور رہ رہ کر ذوق کا یہہ شعر زبان پر آتا ہے

یہہ چمن یونہی رہیگا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائینگے

اللہ بس باقی ہوس

خوش مذاقی

ادب اردو میں جہاں اور بہت سی باتیں ناپید ہیں اس قسم کی ظرافت بھی ہے جسے انگریزی میں (Light Humour) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم نے "خوش مذاقی" مناسب سمجھا ہے بالکل مفقود ہے۔ "خوش مذاقی" کی تعریف بہت مشکل چیز ہے البتہ اس کے مفہوم کو اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ آپ ایک معمولی سا مضمون لکھیں اس سرخی سے "ایک روپیہ کی سرگذشت" اور اس کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں آپ نے لکھا ہے، اور ہنستے بھی جائیں، ہنسی کے یہ معنی نہیں کہ آدمی کا قہقہہ کا یم ہی اڑ جائے، کھل کھلا کر بندوقوں کی باڑ سی ہی داغ دے، ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہئے ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساط کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ دفعہ قارئین پھول کی طرح کھلکھلا ہنس پڑیں تو ایسا مضمون "خوش مذاقی" کا بہترین نمونہ ہوگا "خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کاکٹ اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو، اور منطقی پیچ اور داؤ پیچ ذہن کے لئے پر لطف ورزش بھی ہو جائیں۔ بہرحال اس نوٹ میں خوش مذاقی کے زیادہ تجزیہ کی گنجائش نہیں، یہاں ہمیں اپنے معزز قارئین کی خدمت میں اتنا عرض کرنا ہے کہ قارئین کرام کی خاطر اور اردو ادب میں "خوش مذاقی" کی کمی کے مدنظر ہم اس ٹوہ میں تھے کہ کوئی اس قسم کا نفیس اور گدگدانے والا صاحب قلم

ہاتھ لگے، ہماری نظر ایک صاحب پر تھی، لیکن کچھ تو طبعی کاہلی جو دی اور بہت کچھ عدیم الفرصتی کی وجہ سے انکو لکھنے پر آمادہ کرنا جوئے شیر کا لانا تو نہیں ہاں کسی نو دریافت مجبوب کے رام کرنے سے کم نہ تھا، انہیں کے قلم کی ستم ظریفی ہے اور انہوں نے اسکو پسند فرمایا کہ "مرزا الم نشرح" کے نام کے پردے میں اپنے آپ کو مخفی رکھیں ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین "اس الم نشرح" اخفا کا خیال نہ فرمائینگے۔ ایسی صورت میں "مرزا الم نشرح" کی لطیف تحریر اور ربلیفہ سنج طبیعت اُن کو محفوظ کرتی ہے۔ ہماری نظر میں اُن کا مضمون "ایک نواب صاحب کی ڈائری کے چند پراگندہ صفحے" جو قارئین کے ملاحظہ میں پیش ہیں اور اسی قبیل کے مضامین جو آئندہ ہدیۂ ناظرین ہونگے "خوش مذاقی" کی اُن خصوصیات سے سجے اور سنورے ہوئے پائے جائیں گے جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، مطالعے کے بعد ہمیں یقین ہے کہ یہ بات آپ پر خود "الم نشرح" ہو جائے گی۔ فقط

محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے

ایک نواب صاحب کی ڈائری کے

چند پراگندہ صفحے

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم و رحمۃ و برکاتہٗ۔ عرصہ سے فکر میں تھا کہ رسالہ نمائش کے لئے کوئی مضمون لکھوں، مگر اس کے لئے فرصت چاہیے۔ مجھے دفتر سے چھٹکارا نہیں۔ چند روز ہوئے پیارے لال پنساری کے ہاں سے گھر میں کچھ سودا آیا تھا۔ میں دفتر سے آکر لیٹا تھا، پڑیوں پر نظر پڑی، اٹھا کر دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ کسی کی سوانحعمری کے صفحات ہیں، مضمون دلچسپ اور خط صاف تھا، تمام پڑیاں کھول ڈالیں، دیکھوں تو عجیب پُرلطف واقعات ہیں۔ اسی وقت پیارے لال کے ہاں پہونچا۔ وہاں اور بھی چند کاغذات ملے، مگر سب متفرق و پریشان۔

جو کچھ ملا ہے اس کی نقل روانہ کرتا ہوں۔ میں محنت سے بچا اور آپ کو ایک دلچسپ مضمون مل گیا۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ ڈائری کا مکمل نسخہ نہ ملا اور نہ اب ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ خیر حاضر میں حجت نہیں۔

والسلام

(مرزا الم نشرح)

دیباچہ ڈائری

یہ ناچیز خادم ملک و ملت نواب اسد یار خاں ناظرین کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس کمترین کو کتوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہنی بھی چاہیئے۔ کیونکہ جب باری تعالیٰ نے ان ناپاک ہستیوں کو نجس العین فرمایا ہے تو انسان ضعیف البنیان کی کیا ہستی ہے کہ ان احکام کی خلاف ورزی کرے، اور جب ہمارے ہادیٔ برحق نے کتوں سے کنارہ کرنیکی ہدایت فرمائی ہے تو اب کس کی مجال ہے کہ ان ہدایتوں پر عمل کرنے سے گریز کرے۔

اکثر اصحاب اس ناچیز سے دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کتوں سے نفرت کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب پہلے تو شکسپیر کے اس فقرے سے دیتا ہوں کہ "جذبات انسانی طبیعت کے تابع ہیں، طبیعت اپنے حسب دلخواہ ان جذبات کو نفرت یا رغبت جس طرف چاہے پھیر دیتی ہے" دوسرے میں یہہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال ناقص میں کتوں کا ہلاک کرنا کار ثواب ہے۔ ثواب ہی نہیں بلکہ جہاد، اور جہاد بھی کیسا کہ جہاد اکبر، یہ تو سب جانتے ہیں کہ کافر نجس ہیں، نجس العین نہیں اور یہہ بھی ثابت ہے کہ کتے نجس العین ہیں، جب نجس کو ہلاک کرنا جہاد ہے تو نجس العین کو مارنا یقیناً جہاد سے بھی کچھ افضل ہے۔ یہی خیالات تھے جس کی وجہہ سے میں کتوں کا جانی دشمن ہو گیا جہاں پاتا، مارتا، اور جہاں دیکھتا کم سے کم دو لاتیں تو ضرور رسید کر دیتا۔ البتہ بعض کتے بڑے زبردست اور خوفناک ہوتے ہیں، ایسی صورت میں چونکہ اپنی جان کی حفاظت فرض ہے اس لئے ذرا احتیاط کو کام میں لاتا، کبھی کچلہ سے کبھی کسی طرح انکو ٹھکانے لگاتا۔ خدا کا لاکھہ لاکھہ شکر ہے کہ میری محنت مشکور ہوئی اور میری اس

سرگرمی کی بہ داد ملی کہ پبلک نے مجھے "غازی" کے بجائے "نواب کتے مار خاں" کا خطاب دیا
ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین،

جو جو مشکلات اور مقابلے مجھے اس جہاد میں پیش آئے اُن کو میں نے اپنی ڈائری سے لیکر
ایک جگہ جمع کیا اور اس کا نام "فتوح الکلاب" رکھا ہے

نوشتہ بماند سیہ بر سفید، نویسندہ را نیست فردا امید

اُمید ہے کہ قارئین کرام ان حالات کو پڑھ کر فائدہ اٹھائیں گے اگر میری اس
تحریر نے بعض اصحاب کے دل میں کتوں سے نفرت پیدا کردی، اور وہ میری طرح کتوں کو
مارنے میں ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو میں سمجھونگا کہ میری محنت ٹھکانے
لگی ہے

نصیحت کسے سود مند آیدش ۔۔۔ کہ گفتار سعدی پسند آیدش

والسلام علی من تبع الھدیٰ

خاکسار نواب کتے مار خاں

نوٹ :- اس کے بعد کے چند صفحات غائب ہیں -

کنا پٹیھ میں مکان ملا۔ سامنے ہی ایک نواب صاحب رہتے تھے ۔ اُن کا بڑا
کارخانہ تھا، میری شومئ قسمت (یا خوش قسمتی سے) ایک بڑا زبردست کتا بھی انکے
ہاں پلا ہوا تھا، جب دیکھو دروازے کے باہر بیٹھا ہے، اور ہر آنے جانے والے پر
بھونکتا ہے ظاہر ہے کہ اس کا مارنا مجھ پر فرض ہو گیا، آمنے سامنے کے مقابلے کی تو ہمت
نہ پڑی، ہاں یہ ترکیب اختیار کی کہ جب اُدھر سے گزرتا کوئی نہ کوئی چیز اوسکے کھانے کو
ڈال دیتا۔ اس کو بھی کھانے کا چسکا پڑ گیا اور چند دنوں میں مجھ سے کسی قدر مانوس
ہو گیا، آخر ایک دن دہی میں کچلا دیکر اس کو جہنم واصل کردیا،

نواب صاحب کو خبر ہوئی وہ میرے خطاب اور حالات سے واقف تھے۔ مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میرا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے۔ اس لئے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئے، جا گئی گذری بات ہوئی۔

ایک دن میں باہر گیا ہوا تھا۔ کوئی دس گیارہ بجے جو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دروازے کے سامنے کتوں کا جمگھٹا ہے اور میونسپلٹی کا چپراسی ایک ٹوکری بغل میں مارے کتوں کو گوشت پھینک رہا ہے۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا۔ بھنایا بھنایا چپراسی صاحب کے پاس تک پہنچا اور کہا "بدمعاش یہ تو نے کیا گڑبڑ مچائی ہے، کیا اپنے باوا کی فاتحہ کا کھانا تقسیم کرنے کو میرا ہی دروازہ ملا۔ اب یہاں سے جاتا ہے یا نہیں یا پھر اور طرح خبر لوں" چپراسی ناک بھوں چڑھا کر بولا "اجی جاؤ جی جاؤ" ہم سرکاری حکم کی تعمیل کر رہے ہیں، حکم ہوا ہے کہ روز دس سیر گوشت اس جگہ کتوں کو ڈالا جائے، سرکاری سڑک ہے ایسا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو جا کر ہمارے نام کی نالش کر دو" گوشت کی بو پا کر ادھر ادھر سے کتے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں ہزاروں کا مجمع ہو گیا راستہ بند گھر میں جاؤں تو کس طرح جاؤں اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ایسی بڑی فوج کو چیر پھاڑ کر گذر جاؤں، آخر سوچتے سوچتے یہ سوجھی کہ اس بارے میں کسی وکیل سے مشورہ کرنا چاہیے، ان دنوں لالہ شیو سیوان مل کی وکالت زوروں پر تھی۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا تمام واقعہ بیان کیا اور کہا کہ نواب بجول خاں پر میری جانب سے استغاثہ دائر کر دیجئے انہوں نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ کارروائی نواب صاحب ہی نے کی ہے، میں نے کہا "ہو نہ ہو یہ انہی کی کارستانی ہے وہ میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں انہوں ہی نے اس نامعقول چپراسی کو اس لنگر کی تقسیم پر مقرر کیا ہے" وکیل صاحب نے کہا کہ قیاساً کسی کو ملزم نہیں بنایا جا سکتا" میں نے کہا "تو میونسپل کمیٹی کو ملزم بنا دیجئے" انہوں نے اس سے بھی انکار کیا، تو میں نے جل کر کہا "تو اچھا کتوں ہی کو ملزمین بنا لیجئے"

وکیل صاحب ... معاف فرمائیے میں کتوں کو ملزمین بنا کر اپنی وقعت کھونا نہیں چاہتا،

میں ..... معلوم ہوتا ہے کہ کتوں میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے، اور ان میں اپنی وقعت کم ہونے سے آپ گھبراتے ہیں، یا شاید پہلے جنم میں آپ کتے تھے کہ اپنے سابقہ رشتہ داروں اور دوستوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتے،

وکیل صاحب نے بہت نیلے پیلے ہو کر میری طرف دیکھا مگر سمجھ گئے کہ ہاتھ پاؤں سے مجھ پر ورآنا مشکل ہے، اس لئے کہنے لگے "جناب میں نے عدم تعاون کے اصول پر کاربند ہو کر وکالت ترک کر دی ہے، آپ کسی دوسرے وکیل کی تلاش کیجئے"۔

یہاں سے کورا جواب مل گیا تو میں نے دل میں کہا کہ چلو خود ہی قانون دیکھ ڈالو انہیں وکیل صاحب میں کیا سرخاب کا پر ہے کہ یہی قانون سمجھتے ہیں دوسرا نہیں سمجھ سکتا راستے میں آتے آتے تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری خرید لیا۔ گھر پہنچ کر تمام رات میں ان دونوں کتابوں کو دیکھ ڈالا، معاملہ کوئی پیچیدہ نہ تھا، قانون صاف تھا، کتوں کے افعال سے جرم مزاحمت بیجا پورا بنتا تھا۔ چنانچہ دفعہ (٣٣٩) تعزیرات ہند کے تحت استغاثہ مرتب کیا۔ ترتیب استغاثہ کے وقت یہ دقت پیش آئی کہ آخر ملزمین کس کو بنایا جائے۔ قانون پر غور کرنے کے بعد میں نے استغاثہ کا عنوان اس طرح قائم کیا،

فدا ابسد یار خاں المخاطب بہ کتے مار خاں بہادر ... مستغیث

بنام

جمیع سگان خورد و کلاں بازاری ذات نامعلوم سکنہ علاقہ میونسپل کمیٹی ... ملزمین

علت

مزاحمت بیجا زیر دفعہ (٣٣٩) تعزیرات ہند

استغاثہ میں تمام واقعات مذکورۂ بالا کی صراحت کر کے استدعا کی گئی تھی کہ

چونکہ فاتر العقل ہونیکی وجہ سے کتے مستثنیات عامہ کی دفعہ ۹۹ میں داخل ہو جاتے ہیں اس لئے بعد تحقیقات میونسپل کمیٹی کو سزائے قانونی صادر فرمائی جائے۔

استغاثہ مرتب کر کے دوسرے دن ڈپٹی کلب علی خاں صاحب مجسٹریٹ ضلع کے اجلاس پر داخل کر دیا میرے حلفی بیان کے بعد عدالت سے میونسپل کمیٹی کے نام سمن جاری ہوئے اور تاریخ پیشی پر مقدمہ ہوا، میونسپل کمیٹی کی جانب سے مسٹر کولی بیرسٹر ایٹ لا۔ کونسل تھے، اپنی طرف سے میں نے خود پیروی کی،

سب سے پہلے کونسل ملزمین نے یہ بحث چھیڑی کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیتہ نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ کتوں کے فاتر العقل ہونیکی کوئی شہادت یا ثبوت نہیں ہے، مجسٹریٹ صاحب نے میری طرف دیکھا میں ان مباحث کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا، میں نے بحث کی کہ میرے فاضل دوست نے اپنی بحث کی ابتدا ہی غلط کی ہے پہلے ولایت کا مسئلہ چھیڑا ہے اور بعد میں کتوں کے فاتر العقل ہونیکا ثبوت طلب کیا ہے چاہیئے یہ تھا کہ پہلے کتوں کے فاتر العقل ہونے پر بحث کیجاتی اگر وہ فاتر العقل قرار پاتے تو اس صورت میں ولایت سے بحث کیجاتی،

بہر حال پہلے میں اپنے فاضل دوست سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کتوں کے فاتر العقل تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہے

مسٹر کولی۔ میں بغیر ثبوت کے کسی چیز کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں

ڈپٹی صاحب۔ میرے خیال میں بعض کتے اپنے مالکوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہوتے ہیں،

مسٹر کولی۔ جناب الاصح ارشاد فرماتے ہیں، خود میرا کتا تو بھی ایسا ہی ہے

میں۔ ممکن ہے کہ مسٹر کولی کا کتا خود اُن سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ کتے فاتر العقل نہیں ہوتے بلکہ اگر منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہ

یہ نکل سکتا ہے کہ مسٹر کولی کتوں سے بھی زیادہ فاترالعقل ہیں،

مسٹر کولی۔ جناب والا میں ان الفاظ کی برداشت نہیں کرسکتا،

میں۔ حضور اس مسئلہ کا صغری اور کبری خود مسٹر کولی نے قائم کیا ہے، میں نے تو صرف اسکی بنا پر نتیجہ کا اظہار کیا ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ مسٹر کولی کتوں سے زیادہ بیوقوف ہیں، انہوں نے خود اپنی عقل کا معیار ظاہر کیا۔ تعجب ہے کہ اسی کے دہرانے کو یہ اپنی توہین خیال فرماتے ہیں،

ڈپٹی صاحب۔ اچھا اب آپ اپنی بحث کی طرف رجوع کیجئے۔

میں۔ جناب والا کسی کے عاقل یا فاترالعقل ہونیکا اندازہ اُس کے افعال سے لگایا جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتے بازاروں میں کھڑے ہڈیاں چباتے ہیں اور انکو اپنے اس فعل پر شرم تک نہیں آتی تو اُن کو فاترالعقل کہنے میں کون امر مانع ہو سکتا ہے کیونکہ خود اُن کے افعال اُن کے فاترالعقل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

مسٹر کولی۔ میرے خیال میں انکا اس طرح ہڈیاں چبانا اُن کے فاترالعقل ہونیکا ثبوت قطعی نہیں ہے،

میں۔ اگر میرے فاضل دوست سڑک پر کھڑے ہو کر ہڈیاں چبانے لگیں اور کوئی اُن کو فاترالعقل نہ کہے تو میں کتوں کو بھی فاترالعقل کے زمرہ سے نکال دینے پر بالکل تیار ہوں

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ مستغیث نے جو الفاظ میری نسبت استعمال کئے ہیں وہ میری توہین کی حد تک پہنچتے ہیں۔

میں۔ جناب والا میرے فاضل دوست نے ثبوت طلب کیا۔ میں نے منطق سے اسکا جواب دیا۔ اگرچہ میں میرے اعتراض کا عملی ثبوت دینے پر تیار نہیں ہوں یہ کتوں کی فاترالعقل

نوٹ: یہ کچھ عجب تذاق ہے کہ ہمارے نواب صاحب کو مکان ملا تو کُتّا پیچھے میں، مدمقابل ملے تو بقول قاآنی بیرسٹر ملے تو مسٹر کولی، ڈپٹی صاحب ملے تو کلب علیخاں، وکیل دراصل ہے تو شیو سیوان لال مغز، کتوں کے تذکرہ سے کہیں نجات نہیں ملی، واقعی ہم انغافات [illegible] زمانے کے؛

تسلیم کرلیں، جا چوچیٹی ہوئی نہ مجھ کو حجت نہ اُن کو شکایت۔

ڈپٹی صاحب - بہتر ہوگا کہ اگر آپ اس قسم کی تمثیلات سے پرہیز کریں،

میں - جناب والا - قانون ہمیشہ تمثیلات سے اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اگر تمثیلات سے جناب کو ایسی ہی نفرت ہے تو مناسب ہوگا کہ قانون سے اسکو خارج کردینے کی تحریک فرمادی جائے۔

ڈپٹی صاحب - آپ خیال رکھیں کہ یہ گفتگو آپ کہاں کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ آپکے الفاظ کی بناء پر تحقیر عدالت کا مقدمہ آپ پر قائم ہو جائے۔

میں - حضور والا کی تقریر سے خود میری حجت کی تائید ہوتی ہے۔ عدالت کوئی عاقل شئے نہیں ہے، جس کی تحقیر ہو سکے۔ اگر خدانخواستہ تحقیر ہوگی تو جناب والا کی، اور اگر مقدمہ قائم ہوگا تو اس عنوان سے قائم ہو سکے گا کہ:-

"عدالت (فاتر العقل) بولایت صاحب مجسٹریٹ بہادر مستغیث"

ڈپٹی صاحب - آپ اپنی بحث میں احتیاط کیجئے اور آگے چلئے۔

میں - دوسری بحث فریق مخالف کی جانب سے یہ کی جاتی ہے کہ میونسپل کمیٹی کتوں کی ولیہ نہیں ہے۔ اس کا جواب میں میونسپل کمیٹی کے ضابطہ سے دینا چاہتا ہوں، میرے فاضل دوست اس امر کو تسلیم کریں گے کہ تمام رعایا کے مکانات سے میونسپل کمیٹی ٹیکس وصول کرتی ہے۔ لیکن جو جائیداد خود میونسپل کمیٹی کی ہے، اُس پر ہوس ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ اصول یہ ہوا کہ میونسپل کمیٹی کی جو چیز ہے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اسکا عکس ملاحظہ کیجئے۔ رعایا کے کتوں پر میونسپل کمیٹی ٹیکس لیتی ہے۔ لیکن بازاری کتوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگلی کتے میونسپل کمیٹی کی ملک ہیں اور چونکہ (جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر آیا ہوں) یہ کتے فاتر العقل ہیں اسلئے اُن کا مالک و قابض یعنے میونسپل کمیٹی ان کی ولیہ جائز ہے۔

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے دوست کے ان فقروں سے میرے موکلین کی توہین ہوتی ہے،

ہیں۔ میں اپنے فاضل دوست سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اون کے موکل کتے ہیں یا میونسپل کمیٹی؟ اس صراحت کی مجھے اس لئے ضرورت ہوئی ہے کہ مستغیث کی نگاہ میں بحیثیت ملزمین اس مقدمہ میں کتوں اور میونسپل کمیٹی میں کوئی فرق نہیں ہے،

مسٹر کولی۔ میں معزز عدالت کو پھر توجہ دلاتا ہوں کہ یہہ دوسرے پہلو سے میرے موکلین پر حملہ کیا جا رہا ہے،

ہیں۔ میرے فاضل دوست نے میرے سوال کا جواب عنایت نہیں فرمایا،

مسٹر کولی۔ میں میونسپل کمیٹی کی طرف سے پیروی کر رہا ہوں،

ہیں۔ جب مسٹر کولی کتوں کی طرف سے کونسل نہیں ہیں اور یہہ میونسپل کمیٹی کو کتوں کی ولیہ بھی تسلیم نہیں کرتے تو میں یہہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کونسے قاعدہ کی رو سے کتوں کی طرف سے بحث کر رہے ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اپنے موکل کا نام زمرہ ملزمین سے خارج کرانیکی کوشش کرتے۔ میں جانتا اور بقیہ ملزمین، ہم خود آپس میں بھگت لیتے۔ بحالت موجودہ میونسپل کمیٹی نے جو ایک بیرسٹر مقرر کرکے رعایا کا روپیہ برباد کیا ہے۔ اسکے متعلق میں عدالت سے نہایت ادب کے ساتھ درخواست کرونگا کہ مجھے رعایا کی جانب سے میونسپل کمیٹی پر خیانت مجرمانہ زیر دفعہ (۹۰۴) تعزیرات ہند مقدمہ دائر کرنیکی اجازت دی جائے،

ڈپٹی صاحب۔ آپ صرف اپنے مقدمہ سے سروکار رکھئے،

مسٹر کولی۔ میں مستغیث کے ان مباحث قانونی کا کوئی جواب دیکر عدالت کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ معزز عدالت خود ان کی وقعت پر غور کرکے فیصلہ صادر فرما سکتی ہے، مجھے صرف ایک قانونی بحث ادا کرنی رہ گئی ہے، اور وہ یہہ ہے کہ تعزیرات ہند

میں صرف افعال اشخاص سے بحث کیگئی ہے، جانوروں کے افعال انمیں داخل نہیں ہو سکتے، اگر میں تسلیم کروں کہ چند کتے مستغیث کے دروازہ کے سامنے جمع ہوئے اور بفرض محال انکے سدِ راہ بھی ہوئے تو اُن کے افعال انکو مزاحمت بیجا کے جرم کے تحت میں نہیں لاسکتے،

میں ۔ میں اپنے فاضل دوست کی اس بحث کی قدر کرتا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعزیرات ہند کو نہایت سرسری نظر سے دیکھا ہے، میں اُن سے یہہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ، کیا میونسپل کمیٹی قانوناً ۔ شخص ۔ کی تعریف میں داخل ہو سکتی ہے

مسٹر کولی ۔ ہو سکتی ہے،

میں ۔ یہہ کیونکر؟

مسٹر کولی ۔ کیونکہ چند میونسپل کمشنروں کے مجموعہ کا نام میونسپل کمیٹی ہے، اس وجہ سے لفظ (شخص) کا اطلاق قانوناً اسپر ہو سکتا ہے،

میں ۔ میرے فاضل دوست نے خود اپنے اس جواب سے اپنے اعتراض کو رفع کردیا، جب چند جانداروں کے مجموعہ پر لفظ (شخص) کا اطلاق ہو سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ، کتوں کا مجموعہ لفظ (شخص) کے تحت میں کیوں نہ آئے اور جب کتوں کا مجموعہ لفظ (شخص) سے قانوناً تعبیر کیا جا سکتا ہے، تو جو افعال اس کتوں کے مجموعہ سے سرزد ہوئے ہیں اُن سے تعزیرات ہند کے جرائم متعلق ہو جائینگے

مسٹر کولی ۔ میں اس بحث کے سمجھنے سے قاصر ہوں،

میں ۔ مجھے آپکے دماغ سے یہی امید تھی، کیا اچھا ہوتا اگر آپ اپنے کتے کو بھی ساتھ لے آتے شاید دونوں ملکر اس بحث کو سمجھ لیتے ۔

ڈپٹی صاحب ۔ اچھا آگے چلئے ۔

میں ۔ اب رہی یہہ بحث کہ کتوں کا سدِّ راہ ہونا مزاحمت بیجا ہو سکتا ہے ۔

یا نہیں تو میں اسکے متعلق نہایت تردد ہے کہوں گا کہ ہوسکتا ہے، اور ضرور ہوسکتا ہے میں اپنی اس بحث کو ایک تمثیل سے بہت اچھی طرح ذہن نشین کرا سکتا ہوں، فرض کیجئے ہمارے بیرسٹر صاحب اپنے مکان میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اور ہمارے ڈپٹی صاحب انکے سدِّ راہ ہوتے ہیں، اور اس کشمکش میں ہمارے فاضل دوست کے دوچار ٹھوکریں بھی پڑ جاتی ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مزاحمت بیجا کا جرم مکمل ہوگیا؟

مسٹر کولی - جرم ضرور ہوا اگر جن الفاظ میں وہ بیان کیا گیا ہے، وہ عدالت کی توجہ کا محتاج ہے،

میں - اب بیرسٹر صاحب کے دروازہ پر ڈپٹی صاحب کو کتا سمجھ لیجئے اگر یہ اس کشمکش میں ہمارے فاضل دوست پر بھونکیں اور کاٹ بھی کھائیں، تو کیا جرم مزاحمت بیجا مکمل نہیں ہوا؟

مسٹر کولی - مفروضات کو قانون میں دخل نہیں ہے۔

میں - یہ قانونی مفروضات ہیں، میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ کتے لفظ شخص کی تعریف میں قانوناً آسکتے ہیں، اور آپ یہ تسلیم کریں گے کہ ڈپٹی صاحب بھی قانوناً (شخص) ہیں اسلئے اپنی بحث میں اگر میں نے یہ فرض کر لیا کہ ڈپٹی صاحب کتے ہیں تو کیا ظلم کیا، بہرحال جب ڈپٹی صاحب کا سدِّ راہ ہونا جو مسٹر کولی سے کم تعلیم یافتہ ہیں مزاحمت بیجا ہے تو کتوں کا سدِّ راہ ہونا بدرجہ اولیٰ مزاحمت بیجا ہے کیونکہ ہمارے فاضل دوست تسلیم کرتے ہیں کہ بعض کتے ان سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں -

اس کے آگے کے صفحات غائب ہیں،

. . . .

خدا خدا کر کے مکان ملا، مکان گو چھوٹا تھا لیکن میری ضرورت کو کافی تھا، گھر میں تھا کون (میں میری بلیاں) اور ایک کہوسٹ ماما، دیوان جی مولوی قطب صاحب

مکان تھا، بیچارے بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے تھے، مجھ سے آکر ملے حالات دریافت کئے باتوں باتوں میں کنایتہً مکان چھوڑنے کا بھی ذکر چھیڑ دیا، میں نے تمام واقعات بیان کئے کہنے لگے بھئی معاف کرنا، میرے ہاں بھی ایک کتا پلا ہوا ہے مگر بہت غریب ہے، اور میں کوشش کرونگا کہ وہ آپکو آکر تکلیف نہ دے، کتے کا ذکر سنتے ہی جو وقعت مولوی صاحب کی میرے دلمیں قائم ہوئی تھی وہ ایک قلم جاتی رہی اس کے بعد میں نے اون سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں اور وہ کسی قدر کشیدہ خاطر ہوکر میرے پاس سے اُٹھ گئے چار روز تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، پانچویں روز میں صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک نہایت بدصورت کالا کتا پیخانہ کی مُہری سے نکل کر بہت اطمینان سے اندر آیا اور اسطرح ٹہلنے لگا گویا اسکے باوا کا مکان ہے، میں نے بہت دہت دہت کی اس نے یہہ بھی نہ جانا کہ کون کتا بھونک رہا ہے میں نے فہیمن کو کو پکارا، وہ باورچی خانہ سے لکڑی لے کر دوڑی جب کہیں جاکر یہہ بلا دفعہ ہوئی، اب مشکل یہ آپڑی کہ پیخانہ کے برابر والی دیوار مولوی قطمیر صاحب کی تھی اور مُہری بھی انہیں کی تھی، مُہری بند کس طرح کرتا آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب سوچی، کوئی دو من کا پتھر لیکر عین مُہری کے اوپر منڈیر کے بالکل کنارے پر رکھا پتھر میں رسّی باندھی اور مُہری کے سامنے بیچوں بیچ ایک لمبی سی کیل گاڑ کر اور رسّی کو تانکر اس کا دوسرا سرا کیل میں باندھ دیا، اور دل میں کہا، لو بیٹا اب تو تم آتا کھوپری چورم چور نہ ہو جائے تو میرا نام نواب کتے مار خاں نہیں، دو دن تو خیر سے گذر گیا دوسرے دن صبح ہی کو مولوی صاحب کے کتے نے میرے مکان میں سیر گشت کا ارادہ کیا میں صحن میں بیٹھا اُن کی کارگذاری دیکھ رہا تھا، انہوں نے نہایت اطمینان سے مُہری میں سر ڈالا سر رسّی سے ٹکرایا اُدھر انہوں نے زور کیا ادھر پتھر آہستہ آہستہ منڈیر سے کھسکنا شروع ہوا، ادھر یہہ مُہری سے باہر نکلا ادھر پتھر اوپر سے آیا قیمہ کر کے

وہیں ٹھنڈے ہو گئے، مولوی صاحب کی بیوی نے جو آہ! اسکی سنی تو غل مچایا "ہائے ہائے مولوی صاحب اس حرامزادے نواب نے میرے کتے کو مار ڈالا، خدا اسکو غارت کرے" ایک لمحہ نہ گذرا تھا کہ مولوی صاحب میرے مکان میں آئے اور بغیر سلام علیک کئے سیدھے چھری کے پاس پہنچے کتے کو تخت کے نیچے سے نکالا اور اسی طرح چپ چاپ واپس چلے گئے، مجھے خیال تھا کہ کچھ گلچپ ہو جائے گی، لیکن انکے اس تحمل پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ چلو مفت میں ایک کتا تو کم ہوا۔

ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مجھکو اگر معلوم ہو جاتا کہ مولوی صاحب کا سکون طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہے تو میں پہلے ہی سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا اسکے بعد بی فہیمن کا مولوی صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھا جب دیکھو باورچیخانہ خالی پڑا ہے میں نے کہا "بی فہیمن اسطرح راہ و رسم بڑھانا اچھا نہیں تمہیں میرے پاس رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو، ورنہ خدا حافظ تمہیں نوکری کی کمی نہیں اور مجھے نوکروں کا توڑا نہیں"۔ بی فہیمن نے کہا "میاں میں آپکا کام کاج کر کے دو گھڑی رحمت کی ماں کے پاس جا بیٹھتی ہوں اگر آپکو یہ ناگوار ہے تو آج سے نہ جایا کرونگی"

...... یہ سن کر میں چپ ہو رہا"

دوسرے دن شام کو بی فہیمن ہانپتی کانپتی میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "میاں مجھے بخار چڑھ رہا ہے آپ اجازت دیں تو گھر ہو آؤں۔ کھانا پکا دیا ہے آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ اگر آپ کھانا کھا کر سامان باورچی خانہ میں رکھدیں تو انشاءاللہ میں کل صبح آکر دیکھ لوں گی"

میں نے کہا "اس میں کیا حرج ہے جاؤ گھر ہو آؤ۔ مگر کل صبح ضرور آجانا، ورنہ مجھے تکلیف ہوگی" وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی، اور میں نے باہر کے دروازہ کی

کنڈی لگالی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کمبخت بھی مولوی صاحب سے مل گئی تھی، بخار کا صرف بہانہ تھا۔ مجھے صرف تنہا مکان میں چھوڑ جانا مقصود تھا،

خیر تھوڑی دیر بعد میں نے اٹھ کر وضو کیا عشاء کی نماز پڑھی، گرمیوں کا موسم تھا، باہر سیتل پاٹی ڈالی، باورچی خانہ میں سے کھانا نکال کر لایا، منھ میں نوالہ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ بیچ خانہ کی موری کی طرف سے قیاؤں کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک کالا جنگادری کتا صحن میں نازل ہوا۔ میں نے ہش ہش کی، مارنے کو لکڑی اٹھائی وہ موری کی طرف بھاگا۔ لیکن موری تک نہ پہنچا تھا کہ ایک دوسرا کتا اوسی راستہ سے اندر داخل ہوا اس کے بعد تو کتوں کی قطار لگ گئی، ایک دو تین چار، دس بارہ، بیس پچیس خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم تیس پینتیس کتے اندر گھس آئے، تمام صحن بھر گیا، ایک کو ماروں دو کو ماروں آخر کن کن کو ماروں۔ کتوں نے بھی دیکھا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے اور یہ شخص کچھ سہما ہوا سا ہے، اور بھی شیر ہو گئے، پہلے مجھ پر غرائے، اور پھر کھانے کی بو پا ہی گئی، ایک دم دسترخوان پر ہلہ بول دیا ان کی یورش سے میں پریشان ہو کر بھاگا۔ کتے سمجھے کہ یہ بھی ایک غیر جنس ہے مجھ پر پل پڑے مجھ کو اسوقت اور کچھ نہ سدھ رہا سامنے پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ جست کر کے اوپر چڑھ گیا، ایک کتے نے چڑھتے چڑھتے پاؤں پر منھ بھی مارا۔ مگر میں جوں توں کسی نہ کسی طرح پنکھے جا ہی بیٹھا، اب کیا تھا حرامزادوں کو خوان یغما مل گیا، نہایت فراغت سے دسترخوان صاف کر دیا۔ اور ہم خون کے گھونٹ پیتے پنکھے پر بیٹھے رہے، کھانے اور لڑنے سے فراغت پا کر بدمعاشوں نے مکان کے کونے کونے پر قبضہ کر لیا۔ کوئی کہیں جا بیٹھا۔ کوئی کہیں، دو زبردست کالے کتے عین میرے پنکھے کے نیچے با آرام تمام آکر قالین پر دراز ہو گئے،

جب ذرا امن ہوا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ اس واردات کی بنا پر ان کتوں اور مولوی قطیر صاحب پر کیا جرائم عاید ہو سکتے ہیں، تعزیرات ہند پاس نہ تھی لیکن اتنی

دفعات دھیان میں نہیں۔ آخر رائے یہ قرار پائی کہ نقب زنی بلوہ اور ڈاکہ کے جرائم کتوں پر اور اُن جرائم کی اعانت کا الزام مولوی صاحب پر قائم کیا جا سکتا ہے، وہیں بیٹھے بیٹھے استغاثہ کا مضمون بھی دل میں سوچ لیا، غرض اسی فکر میں رات کے کوئی بارہ بج گئے۔ نیند کا غلبہ ہوا آنکھیں بند ہونے لگیں اور آخر کار آنکھ لگ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ بلوہ نقب زنی اور ڈاکہ کا مقدمہ ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پیش ہوا۔ کتوں کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور مولوی صاحب پر اعانت کا جرم ثابت قرار پاکر ۷ سال کی قید بامشقت اور دس ہزار روپیہ جرمانہ اور بعدم ادائے جرمانہ کی صورت میں مزید تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ جو جرمانہ وصول ہو اس میں سے حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ فوجداری نو ہزار روپیہ مستغیث کو دیا جائے، یہ سزا مرافعہ میں بحال رہی اور مجھ کو جرمانہ وصول شدہ میں سے نو ہزار روپیہ نقد حسب ضابطہ وصول ہوگئے، اب کیا تھا، یار دوستوں نے مبارکباد کی بوچھار کردی اور تقاضا شروع کیا کہ اس خوشی میں جلسہ کیا جائے، خاص باغ میں جلسہ مقرر ہوا، ارباب نشاط بلائے گئے، ساون کا مہینہ ہے، امرائی میں جھولا پڑا ہے یہ خاکسار جھولے میں بیٹھا ہے، ننھی جان اور حفیظن کھڑی جھولا جھلا رہی ہیں، ملار گائے جا رہے ہیں کہ ایک دفعہ ہی جھولے کی رسی ٹوٹی اور میں دھم سے نیچے آ رہا اور گرنے کے ساتھ ہی دو کتوں نے چیخ ماری، آنکھ کھل گئی، دیکھتا ہوں تو پلنگ کے نیچے پڑا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ پلنگ سے جو گرا تو سیدھا کتوں کے اوپر، اُن کو اس بلائے ناگہانی کے نازل ہونے کا کیا خیال تھا ہڈیاں، پسلیاں چورا ہو گئیں، لنگڑاتے اور چیختے ہوئے بھاگے، دوسرے کتے بھی گھبرائے، ان دونوں زخمیوں نے پہلے دروازہ کا رخ کیا اسکو بند پایا تو سیدھے پیخانہ کی موری کی طرف گئے اور زور کر کے پار ہوگئے، جانوروں میں بھیڑیا چال تو ہوتی ہی ہے سب کے سب یکے بعد دیگرے موری سے نکل کر مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہوگئے۔

جب یہ آفت دفع ہوئی تو میں بھی اٹھا کپڑے میں بہت چوٹ آئی تھی مشکل سے کھسکتا کھسکتا
دروازے کے پاس آیا کنڈی کھولی باہر نکلا اور تمام رات سڑک پر بیٹھ کر گزار دی صبح ہی
فہیمن مرزا خود ڈھونڈتی آئیں میں نے انکو بہت برا بھلا کہا، اور حساب کر دیا کیونکہ مثل مشہور ہے
دشمن کا دوست اپنا دشمن آج میرے ساتھ یہ سلوک کیا کل خدا جانے گلا گھونٹ دیں، پھر مجھے
گھر میں آ پا کپڑے بدلے سیدھا ہیوار ہوٹل گیا وہاں کھانا کھایا پھر تعزیرات کی دفعات کو
دیکھا، کوتوالی میں رپورٹ کی لیکن انہوں نے مقدمہ کا چالان کرنے سے انکار کیا اسلئے
خود استغاثہ لکھا اور دس بجے عدالت ضلع میں جا کر داخل کر دیا، تین نفر کتوں اور مولوی
قطب صاحب کو ملزمین بنایا استغاثہ میں نقب زنی بوقت شب حسب دفعہ ۴۵۳ و ڈاکہ
زیر دفعہ ۳۹۵ اور سلاح مہلک کے ساتھ بلوہ زیر دفعہ ۱۴۸ تعزیرات ہند کے جرائم قائم
کئے گئے مجھے دے دلا کر اسی روز سمن جاری کرا دیئے سررشتہ میں یہ اعتراض ہوا کہ
کتوں پر سمن کی تعمیل کیونکر کی جائے ان کو فاتر العقل تو کہا نہیں جا سکتا کیونکہ ہسپیل کتی
والے مقدمہ میں عدالت نے قرار دیا تھا کہ کتے فاتر العقل نہیں ہوا کرتے اسلئے بالآخر بہت
کچھ حجت کے بعد یہ طے پایا کہ کتوں کو نابالغ اور زیر پرورش مولوی قطب صاحب قرار
دیکر مولوی صاحب پر جملہ سمنوں کی تعمیل کرا دی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا، گو اس قانونی
مسئلہ کے سلجھانے میں میرے کئی روپیہ صرف ہو گئے لیکن مجھے اسکی پروا نہ تھی کیونکہ مجھے
یقین تھا کہ آخر میں مولوی صاحب کے جرمانہ میں سے مجھے نو ہزار روپیے ضرور ملیں گے۔

مولوی صاحب کو یقین نہ تھا کہ معاملہ عدالت تک پہنچیگا اس لئے سمن پہنچنے
کے بعد بہت گھبرائے اور مجھ سے آکر معذرت کرنے لگے کہ میرا اس معاملہ میں کوئی قصور
نہیں ہے، ساری کارستانی میرے ٹیپو کتے کی ہے، میں نے کہا کہ مولوی صاحب
میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے مجھے ایک اور ملزم کا نام معلوم ہو گیا کل اسکو
بھی زمرہ ملزمین میں شریک کئے دیتا ہوں، اب رہا معاملہ کا تصفیہ تو وہ یوں ہو سکتا ہے کہ

آپ محلے کے تمام کتوں کو مار ڈالیں، اور چونکہ عدالت سے آپ کے حق میں چھ سال کی قید اور دس ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا صادر ہونے والی ہے، اس لئے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اگر آپ نو ہزار روپیہ بطور ہرجانہ ادا کریں تو میں مقدمہ سے دست برداری کر لوں گا۔ اگر آپ اس پر راضی نہیں ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی قوت آپ کو جیلخانہ جانے سے نہیں روک سکتی۔

میری یہ قانونی بحث سن کر مولوی صاحب حیران ہوگئے بہت جز بز ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے، میں نے کہا مولوی صاحب تحمل سے بات کیجئے گا آپ کا یہ بڑبڑانا آپ کو ایک اور جرم کا مرتکب کئے دیتا ہے آئندہ آپ کے ہونٹ ہلے تو ابھی جا کر استغاثہ میں ازالہ حیثیت عرفی کی دفعہ ۵۰۰ تعزیرات اور بڑھا آتا ہوں اس تقریر سے مولوی صاحب کے رہے سہے حواس گم ہوگئے اور وہ دروازے سے نکل کر دم دبا کر بھاگ گئے۔

مجھے توقع تھی کہ شاید مولوی صاحب پھر مصالحت کا دروازہ کھٹکھٹائیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وکیل کے پھندے میں جا پھنسے اور آپ ان لوگوں کے اصول سے واقف ہیں کہ مردہ دوزخ میں جائے یا جنت میں انکو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔

بہرحال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مار ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا، پہلی پیشی میرے ہی مقدمہ کی تھی، اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں، رسی کا سرا مولوی قطب صاحب کے ہاتھ میں ہے، اور مولوی صاحب مسٹر کولی بیرسٹر بہادر سے کچھ باتیں کر رہے ہیں، ڈپٹی صاحب اسوقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے، میں نے کولی صاحب سے کہا "کیا آپ ان تمام ملزمین کے وکیل ہیں؟" انہوں نے کہا "ہاں" میں نے کہا "کیا مناسب نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرے سے خارج کر دیا جائے" انہوں نے کہا

"نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی" یہہ بالکل قانون کے مطابق جواب تھا لیکن چونکہ مجھے یقین تھا کہ ان ملزمین کو عنقریب حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہونے والی ہے، اس لئے دل پر جبر کرکے ایک کرسی پر بیٹھ گیا، دس بجتے ہی ڈپٹی صاحب اجلاس پر آئے، کتوں کا ہجوم دیکھ کر مسکرائے، اور فرمایا "اچھا ہمارے نواب صاحب کا کوئی سنگین مقدمہ ہے" میں نے نہایت ادب سے سلام کرکے عرض کی حضور والا خود ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس غریب پر کیا کیا ظلم توڑے گئے ہیں اس سے زیادہ میں کچھ عرض کرکے عدالت کی رائے پر اثر ڈالنا خلاف قانون و انصاف سمجھتا ہوں"

مسٹر کولی نے کھڑے ہو کر کہا۔ "مائی لارڈ اس مقدمہ کا دار و مدار محض قانونی مباحث پر ہے کیونکہ اس مقدمہ کے مستغیث اور ہمارے قدیم دوست مولوی اسد یار خاں صاحب نے نہ تو گواہوں کی کوئی فہرست استغاثہ کے ساتھ منسلک کی ہے اور نہ کوئی شہادت طلب کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی محض اپنے بیان اور قانونی مباحث پر اس مقدمہ کا تصفیہ کرانا چاہتے ہیں، اگر یہہ صورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے فاضل دوست کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کرونگا کہ پہلے مقدمہ کے قانونی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تا کہ اگر یہہ ثابت ہو کہ ملزمین کے افعال سے کوئی جرم نہیں بنتا تو مقدمہ کو شہادت لسانی لئے بغیر ختم کر دیا جائے"

ڈپٹی صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "مجھے مسٹر کولی کی رائے سے پورا اتفاق ہے، اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ اگر اپنی تمام عمر میں میرے فاضل دوست نے کبھی کوئی سمجھ کی بات کہی ہے تو آج اور اسوقت کہی ہے"

مسٹر کولی، مائی لارڈ میں امید کرتا ہوں کہ میرے فاضل کو اس طرح میری قانونی واقفیت کی نکتہ چینی کرنے سے روک دیا جائے گا"

میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے فاضل دوست کا دماغ اپنی کمزوری کی طرف رفتہ رفتہ

رجوع کر رہا ہے، اگر وہ اپنے آپ کو بھری تعریف کے لائق نہیں سمجھتے تو میں نہایت خوشی سے اپنے وہ الفاظ جو اُن کی تعریف میں میں نے استعمال کئے تھے، واپس لیتا ہوں، اور اگر لفظ "فاضل دوست" میں لفظ "فاضل" کو اپنی توہین خیال فرماتے ہیں تو میں آیندہ سے بجائے "فاضل دوست" کے "بے وقوف دوست" استعمال کرنے کو تیار ہوں

ڈپٹی صاحب ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے عذر گناہ بدتر از گناہ کی صورت اختیار کی ہے، لیکن چونکہ مسٹر کولی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مستغیث نے جو کچھ کہا ہے وہ کسی بُری نیت سے نہیں کہا اس لئے وہ اس ریمارک سے درگذر کر کے اصل مقدمہ کی طرف رجوع کریں گے۔

مسٹر کولی ، مائی لارڈ! میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے موکلین میں سے اکثر کو نابالغ ظاہر کیا گیا ہے، اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اُن میں سے اکثر جوان ہیں اور اکثر بال بچے والے ہیں،

میں ۔ جناب والا یہ ایک مسلّم امر ہے کہ کتے کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس کو میرے فاضل دوست بھی تسلیم کریں گے کہ بارہ سال والی ہستی قانوناً نابالغ سمجھی گئی ہے، ایسی حالت میں میرا کتوں کو نابالغ قرار دینا کسی طرح غلط نہیں ہے، علاوہ ازیں مستغیث دوسرے کے بلوغ یا عدم بلوغ کا پتہ نہیں چلا سکتا، اگر مسٹر کولی اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اپنے بعض موکلین کو نابالغ بیان کرتے ہیں، تو وہ ابھی ٹٹول ٹٹول کر بالغوں اور نابالغوں کو علحدہ علحدہ کر دیں، میں استغاثہ میں صحت کر دوں گا۔ اس سے استغاثہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ وکیل صاحب کی عقل کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈپٹی صاحب ۔ مسٹر کولی آپ اس کا کیا جواب دیتے ہیں،

مسٹر کولی ۔ مناسب ہے کہ استغاثہ کو بحالتِ موجودہ چلنے دیا جائے۔

ہیں ۔ یہ دوسری سمجھ کی بات ہے جو آج مسٹر کولی کے منھ سے نکلی ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ انہوں نے کہا اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے اکثر موکلین کے دماغوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ جس کا وہ سابق میں اعتراف بھی کر چکے ہیں ۔

مسٹر کولی ۔ جناب الا ہیں اس قسم کے ریمارک کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ ممکن ہے کہ اشتعال طبع کی صورت پیدا ہو جائے ، اور عدالت کوئی دوسری کارروائی کرنے پر مجبور ہو ۔

ڈپٹی صاحب ۔ میں مستغیث کو ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ انہوں نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی جو تحقیر عدالت کی حد تک پہنچی ہو تو میں حسب دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری کارروائی شروع کروں گا ۔

مسٹر کولی ۔ میرے موکلین پر جو تعزیرات ہند کا پہلا جرم قائم کیا گیا ہے وہ نقب زنی ہے ۔ میری ابتدائی حجت یہ ہے کہ کتے نقب زنی کا ارتکاب نہیں کر سکتے ہیں ۔ یہ حجت بلا دلیل ہے ۔ میں یہ کہوں گا کہ کتے نقب زنی انسان سے زیادہ سہولت سے کر سکتے ہیں کیوں کہ ان کے سخت پنجے اور ناخن ہیں ، اور انسان کے نہیں ہیں جو ابھی ان کتوں اور مسٹر کولی کو سامنے کی دیوار کھودنے کے لئے چھوڑ دیا جائے دیکھیں پہلے کتے سوراخ ڈالتے ہیں یا مسٹر کولی ، دوسرے یہ حجت بھی الٹی کی گئی ہے اور کیوں نہ ہو ، مسٹر کولی کے دماغ سے ایسی ہی بحث کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ استغاثہ میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ کتوں نے دیوار میں سوراخ کیا ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دیوار میں موری پہلے سے موجود تھی اور وہ انسان کی آمد و رفت کے لئے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ بنانے سے پانی کے اخراج کیلئے تھی ۔ دفعہ ۴۴۵ ضمن (۲) کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ کسی ایسے راستے سے داخل ہو جو آمد و رفت کے لئے نہ بنایا گیا ہو ۔ اس لئے کتوں کا موری میں سے آنا حسب دفعہ محولہ یقیناً نقب زنی میں

داخل ہے۔

مسٹر کولی۔ اس کا ثبوت کیا ؟

میں۔ جناب والا اب میں ثبوت میں کچھ عرض کرونگا تو پھر اعتراض کیا جائیگا اگر اجازت ہو تو جواب دوں،

ڈپٹی صاحب۔ اچھا اجازت ہے،

میں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ موری آمد و رفت کے لئے نہیں بنائی گئی تھی مسٹر کولی اسکا ثبوت طلب کرتے ہیں، میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ کیا کبھی اس موری سے مولوی ظہیر صاحب میرے مکان میں تشریف لائے تھے، یا کبھی ان کے بال بچے اس راستہ سے آتے جاتے رہتے ہیں، اگر ان لوگوں میں سے کوئی نہیں آتا تو ماننا پڑیگا، کہ یہ موری انسان کی آمد و رفت کے لئے نہیں بنائی گئی اور اگر یہ لوگ اس موری میں سے آمد و رفت رکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ لوگ انسان نہیں جانور ہیں،

مسٹر کولی۔ مائی لارڈ، کیا ان الفاظ سے میرے موکل کی توہین نہیں ہوتی ؟

میں۔ میں نے پہلے ہی حضور والا سے اجازت لے لی ہے اب اگر مسٹر کولی ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو خود عدالت پر دائر کریں، میں ان کی طرف سے شہادت دینے کو تیار ہوں،

ڈپٹی صاحب۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ موری کتنی بڑی ہے ؟

مسٹر کولی۔ اس کے لئے مناسب ہے کہ موقع کا معائنہ کر لیا جائے،

میں۔ میرے خیال میں بھی اسکی ضرورت ہے اور میں عدالت کو باور کراتا ہوں کہ یہ موری اتنی بڑی ہے کہ کتا تو کتا اگر جناب والا معائنہ موقع کے وقت مسٹر کولی کی گردن پکڑ کر موری میں ٹھونس دیں تو یہ بھی باوجود اس تن و توش کے

پھنس پھنسا کر اس جھری سے پار ہو جائیں گے،

معلوم ہوتا ہے کہ اس فقرہ پر مسٹر کولی کو بہت تاؤ آگیا، انہوں نے نہایت زور سے میز پر مکا مارا اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجلاس کا رنگ ہی بدل گیا۔ وجہ یہہ ہوئی کہ مسٹر کولی نے مکا مارتے وقت یہہ خیال نہیں کیا کہ میرا ہاتھ میز پر رکھا ہوا ہے، بجائے میز پر پڑنے کے مکا میرے ہاتھ پر پڑا، بھلا میرے ہاتھ کی تحقیر عدالت ہوتی اور میں خاموش رہتا، چونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے اشتعال طبع ہو جانے کے وجوہ پیدا ہو گئے اور میں دفعہ ۳۰۰ کے مستثنیٰ چہارم میں آگیا ہوں، اس لئے میں نے میز پر کی دوات اٹھائی (خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی تین پاؤ کی تھی) اور اٹھاتے ہی مسٹر کولی کی طرف پوری طاقت سے پھینکی وہ اس وقت سر جھکائے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے کہ دوات عین ان کی چندیا پر پڑی، چندیا تھی صاف اور چکنی وہاں سے اچٹی، پھسلنے کی وجہ سے اس کا رخ اجلاس کی طرف ہو گیا، اور سیدھی ڈپٹی صاحب کی کنپٹی پر بیٹھی اور چشم زدن میں مسٹر کولی کا سر اور ڈپٹی صاحب کا منہ ہم رنگ ہو گئے، ادھر تو اجلاس کے چپراسی اپنی اپنی کمر سے پٹکے کھول کر ڈپٹی صاحب کا منہ پونچھنے کو دوڑے، ادھر مسٹر کولی نے جست کی تو میز کے اوپر وہاں سے کود کر مجھ پر گرنا چاہتے تھے مگر میں پہلے ہی سے اس حملے کے لئے تیار تھا، تیر کاٹ گیا، نتیجہ یہہ ہوا کہ یہ بجائے مجھ پر گرنے کے کرسی پر گرے اور کرسی سمیت اپنے بعض موکلین پر آپڑے، جو کتے ویسے انہوں نے غل مچایا۔ ان کا ساتھ ان کے یاروں نے دیا، غرض ایک قیامت برپا ہو گئی باہر کے لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ دیکھیں اجلاس پر کیا مصیبت نازل ہوئی، ادھر سے یہ کتوں کا غول گھبرا کر نکلا، راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی دو چار تماشائی تو جھپٹ میں آکر چت ہو گئے بعضوں کی ٹانگیں کتوں نے لیں۔ غرض . . . .

. . . .

نوٹ:۔ یہاں سے چند صفحات غائب ہیں۔

اس کے بعد جو صفحہ شروع ہوا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نواب صاحب پر تحقیر عدالت کی کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری شروع کر کے ان کا جواب لیا جا رہا ہے، سوال کا جو ابتدائی حصہ ہے وہ گم شدہ صفحہ میں ہوگا۔

لہٰذا

آپ وجہ ظاہر کیجئے کہ کیوں آپ کے خلاف حسب دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری کارروائی کرنے کی تجویز مناسب نہ کیجائے۔ ۲۰ مئی سنہ ء

شرعد دستخط کلب علیخاں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

یہ کاغذ مجھے دیا گیا۔ میں نے پڑھا، ذرا مسکرایا اور ڈپٹی صاحب سے عرض کی کہ کیا میں زبانی جواب دوں یا تحریری؟

ڈپٹی صاحب۔ تحریری۔

میں۔ کیا میں اپنے جواب میں صاف صاف ظاہر کر دوں کہ جو لوگ قانون سے واقف نہیں اُن کا کرسی عدالت پر بیٹھنا خود تحقیر عدالت ہے، اور جن کا وجود خود تحقیر عدالت ہو کیسی دوسرے شخص پر تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنے کے اہل نہیں ہیں؟

ڈپٹی صاحب۔ آپکو زبانی گفتگو کرنیکی ضرورت نہیں ہے آپ کا جو جی چاہے وہ اپنے بیان تحریری میں لکھ دیجئے۔

میں نہایت اطمینان سے وہیں کرسی پر بیٹھ گیا بستہ کھول کر قانونی کتابیں نکالیں، دفعات متعلقہ کو دیکھا اور حسب ذیل مسودہ تیار کیا۔

باجلاس عالی جناب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہادر

کارروائی زیر دفعہ ۴۸۰ ضابطہ فوجداری سرکار ذریعہ کیپٹن ڈپٹی کلب علیخاں صاحب مستغیث، نواب اسد یار خاں بہادر مستغاث علیہ

بعرض ——— عالی ——— نیرسانند

گذارش ہے کہ میرا اس کارروائی میں جواب طلب کیا جاتا ہے، لیکن جواب دینے سے پہلے میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ عدالت نے اختیار کیا ہے وہ سراسر خلاف قانون ہے، تحقیر عدالت ضرور ہوئی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کی تحقیر عدالت ہوئی مجھے اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ عدالت کے کمرے میں جو داخل ہوتا ہے وہ خود عدالت کا جز ہو جاتا ہے ۔ اگر اس کی یا اس کے کسی حصہ کی تحقیر کی جائے تو وہ عدالت کی عین تحقیر ہے اس لحاظ سے سب سے پہلے تحقیر عدالت میرے ہاتھ کی مسٹر کوبی نے کی، اسکے بعد میں نے نہیں بلکہ دوات نے مسٹر کوبی کے سر کی تحقیر عدالت کی اور اسکے بعد مسٹر کوبی کے سر نے (اس کو میں آخر میں ثابت کرونگا) ڈپٹی صاحب کی کنپٹی کی تحقیر عدالت کی اور پھر مسٹر کوبی نے کتوں کی تحقیر عدالت کی اور کتوں نے تماشائیوں کی تحقیر عدالت کی، ایسی صورت میں تمام اجزا کو ترک کر کے صرف کنپٹی کی تحقیر عدالت کے متعلق کارروائی کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ مقدمہ میں تجزی قانوناً و اصولاً ناجائز ہے،

۲- میں نے مسٹر کوبی کے دوات ماری اور اسکا مجھے قانوناً حق تھا، ملاحظہ ہو دفعہ ۳۰۰ مستثنیٰ چہارم جسمیں حکم ہے کہ اشتعال طبع کی صورت میں قتل عمد بھی جرم نہیں ہوتا،

مجھے حق حاصل تھا کہ اجلاس ہی پر مسٹر کوبی کا گلا گھونٹ دیتا۔ لیکن میں نے صرف دوات کھینچ مارنے پر اکتفا کیا، یہ مسٹر کوبی کا قصور تھا کہ وہ اسوقت گردن جھکائے کھڑے تھے اور دوات انکے سر پر لگی، اگر معمولی جنید یا ہوتی تو اتنی بھاری دوات سے صرف اتنا ہوتا کہ کھوپری ٹوٹ جاتی اور کارروائی وہیں ختم ہو جاتی، یہ کبھی باور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ خاص کرپ کے کارخانہ کی بنی ہوئی کھوپری ہے، یا گھرپیس و باغت

ہوتے ہوتے اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ اس پر سے ایسی بھاری دوات بھی چیخ جائیگی
اگر دوات چیخی تو وہ مسٹر گوبی کی کھوپری کی مضبوطی کا قصور ہے نہ کہ میرا کیونکہ یہ سوء
اتفاقی کی صورت ہے اور میں دفعہ ۸۰ تعزیرات کی رو سے بری الذمہ ہوں،

۳۔ اب رہا یہ امر کہ دوات نے بجائے سیدھا جانے کے اجلاس کی طرف رخ کیوں بدلا تو اسکا جواب بہت صاف ہے، مسٹر گوبی کے سر کی چکنائی اس تبدیل رخ کا باعث ہوئی ہے، ان کی کھوپری نہ ایسی چکنی ہوتی اور نہ دوات اجلاس کی طرف جاتی نہ ڈپٹی کلب علیخاں کی کنپٹی پر لگتی اور نہ کنپٹی کی تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم ہوتا۔ ان حالات میں میں نہایت ادب سے عرض کرونگا کہ اگر جناب والا کو اپنی کنپٹی کے متعلق تحقیر عدالت کا مقدمہ قائم کرنا ہے تو مسٹر گوبی کی کھوپری کی چکنائی پر قائم کیا جائے کیونکہ یہی چکنائی اس تحقیر کا باعث ہوئی، مجھ پر مقدمہ قائم کرنا اور صرف میرا جواب لینا قانوناً صحیح نہیں ہے۔

۴۔ یہاں میں ڈپٹی صاحب کو ایک قانونی صلاح دینا مناسب سمجھتا ہوں گو میں جانتا ہوں کہ ان کے دماغ میں ایسے نازک قانونی نکتہ کا اترنا دشوار ہے مگر بقول سعدی رحمتہ اللہ علیہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است — دگر خاموش بنشینم گناہ است

میں ڈپٹی صاحب کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ قانوناً مسٹر گوبی کی کھوپری یا اسکی چکنائی پر بھی مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا، اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر افعال قدرت کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ مجرم نہیں ہوتا، مثلاً ابھی اس مکان کی چھت بیٹھ جائے اور ڈپٹی صاحب دب کر مر جائیں تو نہ کوئی جرم ہوا اور نہ اسکے متعلق کوئی مقدمہ قائم ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ قدرت کا فعل ہے اور اس پر کسی کو قابو حاصل نہیں ہے، بجنسہ یہی حالت مسٹر گوبی کی کھوپری کی ہے ان کی چندیا قدرت نے

صاف کروی ہے ممکن ہے کہ گھر والوں نے بھی اس صفائی میں کچھ حصہ لیا ہو، اسلئے اگر اسکی وجہ سے دولت کا رخ بدلا تو یہ صورت افعال قدرت میں داخل ہے۔ اور مسٹر کولی جواب دہ قرار نہیں دیئے جا سکتے، البتہ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ آج خاص اسی غرض سے مسٹر کولی سر منڈوا کر اور تیل مل کر آئے تھے تو وہ یقیناً اپنی کھوپری کی چکنائی کے ذمہ دار ہونگے،

لہذا استدعا ہے کہ

کارروائی ختم اور مثل داخل دفتر کیجائے، اور چونکہ اپنی درخواست کے فقرہ ۷ میں میں نے مسٹر کولی کی جانب سے وکالت کی ہے اور ان کو ایک سنگین مقدمہ سے بچا لیا ہے، اس لئے مجھے ان سے معقول محنتانہ دلایا جائے۔

نوٹ:۔ مناسب ہوگا کہ عدالت مسٹر کولی کو ہدایت کر دے کہ وہ آئندہ جب اجلاس پر آئیں تو اپنے سر پر اچھی طرح سینڈ پیپر (ریگمال) مل کر آیا کریں تاکہ اس قسم کے واقعات کا ہمیشہ کے لئے سدباب ہو جائے۔ واجب تھا عرض کیا گیا۔

دستخط نواب اسد یار خاں

ڈپٹی صاحب جواب پڑھ کر بہت گھبرائے لیکن بے حیائی تیرا ہی آسرا ہے کچھ سمجھے سمجھائے تو نہیں چار سطر کی ایک تجویز ٹھونک ماری کہ "ملزم کا بیان دیکھا گیا۔ ہماری رائے میں جو جواب ملزم نے دیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ

نوٹ:۔ اس کے آگے کے صفحات غائب ہیں۔

غالب بیسنی روٹی کی تعریف کریں تو کریں، میں تو یہی کہونگا کہ لعنت ہے بیسن اور بیسنی روٹی پر، میرا ہی دل خوب جانتا ہے کہ اس بیسنی روٹی نے مجھے کیا کیا ناک چنے چبوائے ہیں۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ زہر کھا لوں گا، مگر بیسنی روٹی کے پاس نہ جاؤنگا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ابر آیا ہوا تھا، کچھ پھوار بھی پڑ رہی تھی، ہماری ماما جی باورچی خانہ سے مسکراتی ہوئی آئیں اور کہا "میاں کہو تو آج بیسنی روٹی پکا لوں" میں نے کہا اچھا پکاؤ، موسمی چیز ہے، مگر خدا کے لئے گھی نہ رکھنا، ایسا نہ ہو کہ بدہضمی ہو جائے بڑی بی بولیں "اے توبہ میاں ایسی فال زبان منہ سے نہ نکالئے، دور پار، میں کوئی آپکی دشمن ہوں کہ گھی روٹیاں کھلا کر دشمنوں کو بیمار ڈالونگی" یہ کہہ کر جو وہ باورچی خانہ میں گھسی تو اللہ کی بندی نے ایک بجا دیا، میں کھانے والا تو بجے کا، انتظار کرتے کرتے بیزار ہو گیا، لیکن روٹیاں نہ آتی تھیں نہ آئیں، آنتوں نے ڈیڑھ لاکھ قل ہو اللہ کا ختم پورا کیا، جب کہیں خدا خدا کر کے بڑی بی کی شکل نظر آئی، مجھے تاؤ تو بہت تھا، مگر بیسنی روٹیوں کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا، ایسی پتلی پتلی اور سرخ سرخ تھیں کہ دل لوٹ گیا کھانے پر جو ڈٹا تو ڈاڑھی کی بندوق بھر لی، سچ ہے، جبڑا اور غلام منہ لگ کر نہیں چھوٹتا اتنا کھایا اتنا کھایا کہ حلق تک آ گیا۔ جب دسترخوان صاف ہو گیا تو خدا خدا کر کے اٹھا پانی پیا اور ذرا لیٹ گیا، تھوڑی دیر میں لگی پیاس۔ اٹھ کر پانی پیا، پھر پیا، لیکن پیاس تھی کہ کسی طرح نہ بجھتی تھی، پیٹ پھول کر نقارہ ہو گیا، اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، باہر نکل کر کیا دیکھتا ہوں کہ ڈپٹی قلب علی خاں صاحب کھڑے ہیں، یہ اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لانے لگے تھے جب کوئی پیچیدہ قانونی مسئلہ پیش آ جاتا تو حل کرنے اکثر میرے پاس آ جاتے تھے، خیر ان کو ساتھ لے دیوان خانہ میں جا بیٹھا سامنے میز پر "رسالہ نمائش" رکھا تھا وہ انہوں نے اٹھا لیا اور اسکے دیکھنے میں محو ہو گئے میرے پیٹ کی بری حالت تھی، بس پھٹنے کے قریب تھا، کسی طرح چین نہ آتا تھا آرام کرسی پر میں نے بہت بہت پہلو بدلے، ٹانگیں کرسی کی دستیوں پر پھیلا کر سہولت راہ پیدا کی، توند کو کچھ سہلایا، کچھ دبایا، مگر باوجود اس قدر کوششوں کے ایک بھی امر باعث ندامت صادر نہ ہوا، اسی جد و جہد میں آنکھ لگ گئی کیا دیکھتا ہوں کہ

ایک بڑے غدار شہر میں جارہا ہوں، سڑکیں صاف ستھری اور ستھری ہیں، مگر پتلی پتلی مکان خوشنما اور خوبصورت ہیں، مگر نیچے نیچے بازاروں میں خوب چہل پہل ہے، ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے، بعض بے فکرے کوٹ پتلون پہنے، سگریٹ منہ میں دبائے لکڑی ہلاتے ٹہل گشت کر رہے ہیں، بیچوں بیچ شہر میں ایک عالیشان عمارت ہے، طالبعلم بستے بغل میں دبائے اس میں چلے جا رہے ہیں مجھے بھی شوق ہوا، دل میں کہا چلو، ٹہلتے چلتے یہاں کا طریقۂ تعلیم بھی دیکھ لیں، اندر گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ سیکڑوں طالبعلم اکڑوں بیٹھے، کتابیں اگلے پنجوں پر رکھے، پروفیسر صاحب کا لکچر سن رہے ہیں، اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان سب کی شکلیں انسانوں کی بہ نسبت کتوں سے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔

پروفیسر صاحب کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، اگر کوئی جاندار ان کے ہم شباہت ہونیکا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ صرف خارشتی لیڈی کتا ہے، ان کی مختصر ناک پر بڑے تاؤں اور سیاہ کمانیوں کی فیشن ایبل عینک عجیب بہار دے رہی تھی۔

سیاہ کوٹ پتلون زیب تن تھا، پشت کی طرف پتلون کا ابھار ظاہر کر رہا تھا کہ زبردستی کسی چیز کو موڑ کر اندر دبا دیا گیا ہے، کوٹ کے اوپر سیاہ گون اور سر پر سفید نے دار جو کوئی ٹوپی تھی، وہ اس وقت علم ارتقا پر لکچر دے رہے تھے، جس وقت میں داخل ہوا تو وہ فرما رہے تھے "جو ہستی فطرت کے اصول کو تبدیل کر سکے اسکو حق حاصل ہے کہ اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرے، فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر جاندار مار پڑنے پر چیخے چلائے اور آنسو بہائے، سوائے کتوں کے آپ ایک جاندار بھی ایسا نہیں بتا سکتے جو اس اصول مقررہ پر کاربند نہ ہوتا ہو، کتے ہی وہ قابل قدر ہستی ہیں جو اس اصول فطرت کے تابع نہیں ہیں، وہ مار کھانے پر چیختے اور رونے کے

بجائے واہ واہ، واہ، واہ کے نعرے لگاتے ہیں، اور اس طرح تعریفوں سے مارنے والے کا دل بڑھاتے ہیں، فطرت کا دوسرا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ زمانہ کی ٹھوکریں بڑے بڑے ٹیڑھوں کو سیدھا کر دیتی ہیں لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ بارہ برس تک ہماری دُم زمین میں دبائی گئی پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہی،

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ کتے ہی اشرف المخلوقات کا لقب اختیار کرنے کے مستحق ہیں، چنانچہ بعض عاقل اور سمجھدار انسانوں نے اپنے سے کتوں کو افضل مانا اور تسلیم کیا ہے،

(یہاں سے کچھ حصّہ غائب ہے)

. . . .

حلم کتوں کا شیوہ ہے اور متانت ان کا شعار" کتوں کی اتنی تعریفیں سُن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں نے چیخ کر کہا "ابے کتے کے بچے! اپنے منہ میاں مٹھو! تم کتے تھے کتے ہو اور ہمیشہ کتے ہی رہوگے" پروفیسر صاحب نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، انکو ایک غیر جنس نظر آیا، اپنی ساری متانت بھول گئے کرسی پر قلابازیاں کھاتے، میری طرف لپکے، اُن کے ارادہ کا اندازہ کرکے، میں دروازہ کی طرف بھاگا، میں آگے اور وہ پیچھے، دروازہ قریب تھا میں نکل یہ جا وہ جا، مگر وہ بھی خالی ہاتھ نہ گئے، میرے پائجوں کے حد اتصال کا کچھ حصّہ اپنے منہ میں لے گئے، وہ سمجھے کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، میں سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے، فی الحال میانی نہ شد نہ شد، گھر جا کر دوسری ڈلوا لیں گے،

اسکے بعد کا کچھ حصہ غائب ہے

بازار میں ٹہل رہا تھا کہ چند کتے پولیس والوں کا لباس پہنے گلے میں پٹے اور زنجیریں ڈالیں میری طرف آئے، ایک نے جو انکا افسر معلوم ہوتا تھا اپنا پنجہ میری پیٹھ پر رکھا، اور کہا "آپ کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے"، میں نے کہا کہ بیٹھے

کسی کو قتل نہیں کیا" اس نے جواب دیا کہ "اس وقت آپ جو کچھ بیان کریں گے وہ آپ کے خلاف شہادت میں استعمال کیا جا سکے گا" چونکہ یہ قانونی جملہ تھا اس لئے میں خاموش ہو گیا، ایک نے اپنی گردن میں سے پٹہ اور زنجیر کھولی پٹہ میری گردن میں ڈال دیا اور زنجیر افسر کے ہاتھ میں دے دی، میں نے چلنے میں ذرا ہچر مچر کی تو اس کے ساتھ والوں نے بھونکنا اور منہ مارنا شروع کیا، خلقت کا اژدہام ہو گیا، کتوں کا مجمع خلاف قانون دیکھ کر میرے اوسان باختہ ہو گئے، ہمت نے جواب دے دیا، اور میں کان دبائے ان کتوں کی پولیس کے ساتھ ہو گیا، پہلے یہ مجھ کو اسٹیشن ہاؤس پر لے گئے وہاں سے ایک دفتر مثالوں کا نکالا" اور دو چار کانسٹبلوں کو مدعیوں اور گواہوں کو بلانے بھیجا، وہیں پہنچتے ہی مجھ کو عدالت میں لے گئے، اور ملزمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا، اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تمام کمرہ کتوں سے بھرا ہوا ہے، تل رکھنے کو جگہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ میری گرفتاری کی خبر نے یہ مجمع کثیر جمع کر دیا تھا، اجلاس پر ایک بڑا زبردست بلڈاگ بالوں دار ٹوپی (وگ) پہنے ناک کی پھننگ پر عینک لگائے، سرخ گون زیب تن کئے بیٹھا ہے، سامنے ایک لمبی میز پر دونوں جانب وکلا کی قطار ہے، یہ رنگ دیکھ کر میری آنکھوں میں ڈپٹی کلب سلیمان کے اجلاس کا نقشہ پھر گیا، گو اس مجسٹریٹ کی شکل بالکل تو ان سے ملتی نہ تھی، لیکن دونوں میں مشابہت ضرور تھی، مجسٹریٹ صاحب نے بہت غرا کر کہا ..... کیا ملزم حاضر ہے،

پیروکار سرکار اٹھے، کیا کہوں بالکل انسپکٹر کوتوالی معلوم ہوتے تھے، اگر فرق ہوگا تو بس ایک سینگ کا ہوگا، انہوں نے پہلے اپنی طرف دیکھا، پھر اجلاس کی طرف دیکھا، عینک ٹھیک کی، گون کی ایک پٹی کو انگلی پر لپیٹا، گردن جھکائی، پھر اٹھائی پھر جھکائی اور کہا کہ

پیروکار سرکار جناب والا ملزم حاضر ہے، اس پر وارنٹ کی تعمیل باقاعدہ طور پر ہوئی ہے

اور اسکے خلاف جس قدر چالان ہیں وہ بالکل تیار ہیں، مدعی بھی حاضر ہیں اور گواہ بھی موجود ہیں،

مجسٹریٹ:۔ مسٹر ٹوپی اسوقت کتنے مقدمات ایسے ہیں جنکی تکمیل آج کی جا سکتی ہے۔؟

مسٹر ٹوپی، مائی لارڈ یوں تو ملزم کے خلاف ہزار ہا مقدمات ہیں لیکن اُسنے اکثر ایسے موقعوں پر اور اس طرح ہمارے عزیز بھائیوں کو ہلاک کیا ہے کہ اُن کے متعلق کوئی گواہ ہم کو ہمدست نہو سکا لیکن پھر بھی اسوقت ڈیڑھ سو مقدمات ایسے تیار ہیں جنمیں مکمل شہادت پولیس کو فراہم ہو چکی ہے اور انہیں کی تحقیقات میں جناب عالی کے اجلاس پر کرانا چاہتا ہوں،

مجسٹریٹ نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ "تم ان مقدمات خود پیروی کروگے یا کوئی وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو؟"

میں۔ جناب عالی میں اپنے مقدمات میں خود پیروی کرتا ہوں، لیکن میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے، میں کس کے قتل کے الزام میں ماخوذ کیا گیا ہوں، اور آپ کو ان مقدمات کی سماعت کا اختیار کیسے حاصل ہوا ہے اگر کسی کتے کو کتے نے مارا ہوتا تو البتہ اس مقدمہ کی سماعت اس اجلاس پر ہو سکتی تھی مگر جب کسی مقدمہ میں کوئی انسان ملزم قرار دیا گیا ہو تو اسکی سماعت انسان ہی عدالت میں ہو سکتی ہے،

مسٹر ٹوپی۔ مائی لارڈ، ملزم کا استدلال صحیح نہیں ہے، میں ملزم کی اس بحث کے باضابطہ نقول داخل عدالت کرتا ہوں، جو اُس نے ڈپٹی کھب علی خاں صاحب کے اجلاس پر کی تھی، جب انہوں نے بہ حیثیت مستغیث کتوں کو ملزمین قرار دیکر انسان کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا، تو کوئی وجہ نہیں ہوتی کہ

وہ مقدمات جن میں کتے مستغیث اور یہ ملزم ہیں کتوں کی عدالت میں کیوں سماعت نہ کیے جائیں ؟

جج ، اگر اس بحث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو مجھ کو یہ عذر ہے کہ چونکہ ہلاکت انسانوں کی عدالت کے حدود اختیاری میں واقع ہوئی ہے ، اس لئے ان مقدمات کی سماعت حسب دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند موجودہ اجلاس پر نہیں ہو سکتی ۔

مسٹر ٹوبی ، شاید ملزم کو دفعہ (۱۸۰) ضابطہ فوجداری ہند کے اس جزو کا خیال ہے جس کی رو سے مقدمات قتل کی تحقیقات صرف اسی عدالت میں ہو سکتی ہے جس کی حدود میں ہلاکت واقع ہوئی ہو ۔ لیکن ملزم پر یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں ضابطہ فوجداری ہند نہیں بلکہ ضابطہ فوجداری کلاب نافذ ہے ، اور اس کی جو دفعہ اس کارروائی سے متعلق ہے وہ دفعہ (۱۸۱) ضمن (۱) ضابطہ فوجداری ہند کے مماثل ہے ، اس میں مرقوم ہے کہ مقدمات قتل کی تحقیقات نہ صرف اسی عدالت میں ہو سکتی ہے جہاں ہلاکت واقع ہوئی ہو بلکہ اس عدالت میں بھی ہو سکتی ہے جہاں ملزم پایا جائے ؛

جج ۔ مگر ضابطہ فوجداری کلاب انسانوں سے متعلق نہیں ہو سکتا ،

مسٹر ٹوبی ، اس کے دو جواب ہیں ، ایک عقلی دوسرا نقلی ، جس عدالت میں مقدمہ کی تحقیقات کی جائے اس میں وہی قانون استعمال کئے جائیں گے جو وہاں کی مجلس وضع قوانین نے نافذ کئے ہوں ، میں دو پر ثابت کر آیا ہوں کہ ملزم کے خلاف جو مقدمات ہیں ان کی تحقیقات اسی عدالت میں ہو سکتی ہے ، اس لئے اسی ملک کے نافذہ قانون ان مقدمات کے انفصال میں استعمال ہوں گے ، دوسری بحث کے متعلق میں ملزم کے ان استغاثوں کی باضابطہ نقول داخل کرتا ہوں جو اس نے اپنے ملک کی عدالت میں پیش کئے تھے ، وہاں اس نے کتوں پر تعزیرات ہند کے الزامات لگائے ہیں ، جب انسانی

عدالت میں کتوں کی تحقیقات تعزیرات ہند کی رو سے ہو سکتی ہے تو ملیں کوئی وجہ نہیں پاتا کہ کتوں کی عدالتوں میں انسانوں کی تحقیقات خود کتوں کے قوانین نافذہ کے تحت کیوں نہ کی جائے

مجسٹریٹ: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ملزم اپنے دشمنوں کے ملک میں اپنی خوشی سے کس طرح آ گیا

مسٹر ٹوبی: مائی لارڈ، یہ ہمارے ملک کی پولیس کا ایک روشن کارنامہ ہے۔ ان مقدمات کے تعلق کے لئے سب سے اہم اور مشکل کام ملزم کی گرفتاری تھا۔ لیکن ملزم کی ماما کی اعانت اور ہمارے اور ہمارے فارنٹ نے جو میٹھی روٹی کی شکل میں نافذ ہوا تھا، اسکو آسانی ہمارے قبضہ میں پہنچا دیا۔

یہ سن کر مجھے بہت تاؤ آیا اور میں نے عہد کر لیا کہ اگر بخیر و خوبی اس مخمصے سے نجات پائی تو گھر جا کر بڑھیا کا گلا ہی گھونٹ دونگا، رہی میٹھی روٹی تو وہ آئندہ نہ میں خود کھاؤنگا نہ حتی المقدور دوسروں کو کھانے دونگا، بس سمجھ لو کہ اس وقت تک تو صرف گیہوں سے دشمنی تھی، آج سے چینی سے بھی بیر ہے،

مجسٹریٹ: مسٹر ٹوبی آپ اپنا سب سے مضبوط مقدمہ پیش کیجئے تاکہ ملزم پر اگر جرم ثابت قرار پائے تو اسکی تجویز موت کے ساتھ بقیہ کل مقدمات کا خود بخود خاتمہ ہو جائے۔

مسٹر ٹوبی: مائی لارڈ، میں اس قیمتی مشورہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور سب سے پہلے مولوی قطمیر صاحب کے کتے کے قتل عمد کا مقدمہ شروع کرتا ہوں،

مسٹر ٹوبی نے مقدمہ کے واقعات تفصیل سے بیان کئے اور جس طرح پتھر کے گرنے سے اس کتے کی موت واقع ہوئی تھی، اسکی صراحت کرنے کے بعد کہا کہ مائی لارڈ میں اپنی بحث کے آخر میں ثابت کرونگا کہ قتل عمد کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ ملزم خود اپنے ہاتھ سے کسی کی ہلاکت کا باعث ہو، بلکہ بعض صورتوں میں ملزم کے ایسے افعال بھی

جو بظاہر جرم نہ معلوم ہوتے ہوں اسکو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آتے ہیں، اس قدر بحث کے بعد اب میں مقدمہ میں شہادت پیش کرتا ہوں، اس مقدمہ کا پہلا گواہ وہی مفتش ہے جس کی کارگذاری بالآخر اس ملزم کی گرفتاری کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے، گواہ کو آواز دی گئی، اس نے گواہوں کے کٹہرے کھڑے ہو کر حلف لیا جس کو میں سمجھ نہ سکا اس لیے میں نے اعتراض کیا کہ "حلف اس طرح اور اس طریقہ سے ہونا چاہیے کہ جس سے ملزم کو اطمینان ہو جائے کہ گواہ سچ بول رہا ہے۔

مجسٹریٹ۔ حلف کا یہ اصول صحیح نہیں ہے، چونکہ عدالت گواہ کے سچے یا جھوٹے ہونیکی تنقید کرتی ہے، اس لئے حلف اسی طرح اور اسی طریقہ سے لیا جاتا ہے جس سے عدالت مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جارہا ہے وہ قابل اعتبار ہے مفتش نے واقعات مقدمہ بیان کئے، اور آخر میں میرے طریقہ گرفتاری پر روشنی ڈالی، اس سے معلوم ہوا کہ، میری ماما کتوں کی بڑی شوقین تھی، اور ایک کتے سے جو در اصل مفتش مقدمہ تھا اسکو بڑی محبت ہو گئی تھی، اس کتے نے رفتہ رفتہ اپنے طرز عمل سے اس بڑھیا پر ثابت کیا کہ اسکو میٹھی روٹی کا بہت شوق ہے، چنانچہ چند روز تک وہ بڑھیا چرا چھپا کر اس کتے کو میٹھی روٹی کھلاتی رہی ایک دن اس نے مجھے بھی میٹھی روٹی کھلانے پر آمادہ کیا تاکہ بچے ہوئے ٹکڑوں سے اس کتے کا بھی کھانا نکل آئے، یہ وہ جال تھا جس میں مجھے پھنسایا گیا، اور میں عدم واقفیت کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا،

مفتش کے ابتدائی بیان کے بعد میں نے اس پر جرح کرنی چاہی تو اسپر مجسٹریٹ نے کہا کہ اس عدالت میں کسی گواہ پر جرح کی اجازت نہیں دی جاتی اور نہ ہمارے قانون شہادت میں جرح کی کوئی دفعہ قائم کی گئی ہے۔

میں۔ لیکن قانون شہادت ہند کی رو سے کوئی بیان قابل ادخال شہادت

نہیں ہو سکتا جب تک فریق ثانی کو اُس پر جرح کا موقعہ نہ دیا گیا ہو،

مجسٹریٹ ۔ جرح اس لئے کی جاتی ہے کہ گواہ کی سچائی کا امتحان ہو سکے جب ایک گواہ حلف لے کر کچھ ظاہر کرے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بیان کو سچ کیوں نہ سمجھا جائے ۔

مسٹر ٹوپی ۔ مائی لارڈ ، ملزم اُن لوگوں کے قانون کا حوالہ دیرہا ہے جو حلف لے کر بھی جھوٹ بولنے میں تامل نہیں کرتے ، اور جو حلف کی وقعت کو نہیں سمجھتے ، جناب والا کا ارشاد بالکل صحیح ہے ، یا تو گواہ کو حلف نہ دیا جائے ، اور اُس کی صداقت کا امتحان بذریعہ جرح کیا جائے ۔ یا اس کو حلف دیا جائے تو اسکے بیان پر بلا جرح اعتبار کرنا چاہئے ۔

مجسٹریٹ ۔ دوسرے گواہ کو بلایا جائے ۔

آواز دی گئی اور ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی عورت کٹہرے میں داخل ہوئی میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا ، کہ یہ میری چاہتی بلی ہے ۔ عفت ہے جس کو میں جان کے برابر رکھتا تھا ، وہی آج میرے خلاف شہادت دینے آکھڑی ہوئی ، سچ ہے بلی کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے ،

گواہ نے مسٹر ٹوپی کے سوالات کے جواب میں بہ حلف بیان کیا کہ میں ملزم کے پاس ایک عرصے سے رہتی ہوں ، اُن کے مکان سے ملا ہوا مولوی قطمیر کا مکان ہے ملزم کے مکان کے پیچھے کی کوٹھری ، مولوی صاحب کے مکان میں نکلتی ہے ، تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوا ہوگا کہ . . . .

(آگے کے صفحات غائب ہیں ، جس میں گواہوں کے بیانات ، بحث اور فیصلہ کا بڑا حصہ ہوگا کیونکہ جو صفحہ اس کے بعد کا ہے وہ فیصلہ کے جزو آخر سے شروع ہوتا ہے

بہر حال شہادت پیش شدہ سے کوٹھری کے عین اوپر کی منڈیر پر پتھر کا رکھنا ۔ پتھر سے رسی باندھ کر اس کا دوسرا سرا کوٹھری کے سامنے کیل سے لپیٹ دینا ۔ مولوی قطمیر صاحب کے کتے کا کوٹھری میں سے نکلنے کی کوشش کرنا ، اس کوشش کرنے میں رسی کا اُلجھ

ٹکرانا اور پتھر کا اوپر سے گرا کر اُس کو ہلاک کرنا پوری طرح ثابت ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملزم کے ایسے افعال کا نتیجہ [illegible] اسکو قتل عمد کا مجرم قرار دے سکتے ہیں یا نہیں، اس بارے میں شرع شریف نے نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور عدالت کو اُن کی بحث سے پورا اتفاق ہے، اگر ملزم یہ نتیجہ اخذ کرنے کی وجہ رکھتا ہو کہ اس کے افعال سے ہلاکت واقع ہونے کا احتمال ہے یا غالباً اس کا نتیجہ ہلاکت ہے یا وہ افعال حسب طبیعت معمولہ بنا بر اں ہلاکت کے لئے کافی ہیں، تو ملزم کے ایسے افعال اُسکو جرم قتل عمد کے تحت میں لے آئیں گے، اور جیسا کہ ہم شہادت سے بحث کرتے ہوئے ثابت قرار دے چکے ہیں کہ ملزم کو یہ معلوم تھا کہ مولوی قطب شاہ صاحب کا کتا اس مہری سے آمد و رفت رکھتا ہے تو اس کا ایسا بڑا پتھر اس طرح منڈیر پر رکھنا اور اس کا سلسلہ رسی سے اس طرح قائم کرنا کہ مہری سے آنے جانے والے کی ذرا سی ٹھیس سے وہ گر سکے اور بلحاظ اپنی جسامت کے ایک بڑے سے بڑے کتے کے ہلاک کرنے کو کافی ہو تو اس کے افعال بدنیتی پر دلالت کریں گے اور اس کا قانونی نتیجہ یہی نکلے گا کہ ملزم نے وہ افعال اس نیت سے کئے تھے کہ مولوی قطب صاحب کے کتے کی ہلاکت واقع ہو۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں ملزم پر جرم ثابت قرار دیتا ہوں اور چونکہ ورثائے مقتول خواہان قصاص ہیں،

لہٰذا حکم ہوا کہ

ملزم کتے مار خاں کو بپاداش جرم قتل عمد ہلاک کیا جائے۔ اور ایک درجن کتے اس کے پیچھے اس غرض سے چھوڑے جائیں کہ وہ ملزم کو اس وقت تک کاٹیں اور بھنبھوڑیں کہ اس کی جان جسم سے نکل جائے، ملزم کی تمام جائیداد ضبط کی جائے حسب دفعہ ۵۴۵ ضابطہ فوجداری ورثائے مقتول میں تقسیم کر دی جائے۔

ترجمہ دستخط مسٹر بل ڈاگ سیشن جج کتا نگر

نوٹ۔ فیصلہ کی فوراً تعمیل کیجائے

میں۔ اگر جناب والا مجھے مرافعہ کا حق حاصل ہے، اور ابھی اس فیصلہ کا نفاذ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کا محتاج ہے۔

مجسٹریٹ۔ یہاں مرافعہ کا نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ لوکل گورنمنٹ کی منظوری کی ضرورت یہ اُن ممالک کا دستور ہے جہاں گواہوں کے بیانات پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ ہوتی ہے، چونکہ ہماری عدالتوں میں کوئی گواہ حلف لے کر جھوٹ نہیں بولتا اس لئے شہادت سے صرف ایک ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اور اسی لئے یہاں کوئی عدالت مرافعہ قائم ہی نہیں کیگئی، اور لوکل گورنمنٹ کو عدالتی کارروائیوں میں کوئی دخل ہے۔

(پولیس والوں کی طرف دیکھ کر)

مجرم کو مقتل میں لے جاؤ۔

مجسٹریٹ کا حکم سنتے ہی پولیس والے کشاں کشاں مجھے ایک بڑے میدان میں لے گئے۔ اس میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے کٹہرے تھے۔ تمام شہر میں قتل کا تماشا دیکھنے امنڈ پڑا تھا۔ کٹہرے کے گرد کتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ تھے جہاں تک نظر جاتی تھی کتے ہی کتے نظر آتے تھے مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میرے جلادوں میں خود مجسٹریٹ صاحب بھی شریک ہیں، میری غیرت کو حرکت ہوئی اور میں نے ٹھان لی کہ مرنا برحق ہے مگر مرتے مرتے دو چار کتوں کو موت کے گھاٹ اتار دونگا مجھے میدان میں ان جلادوں سے کوئی دس قدم آگے کھڑا کیا گیا، ایک کتا میدان میں جھنڈی لے کر آیا جب اُس نے دیکھا کہ سب مستعد ہو گئے تو ایکدفعہ ہی اُس نے جھنڈی گرائی اور میری موت و زیست کی دوڑ شروع ہوئی، میں نے بھی وہ چکر دیئے اور وہ وہ پلٹیاں لیں کہ بہت سے کتوں کی کمریں توڑ دیں، جو کوئی قریب آیا اسکو دو چار لاتیں رسید کیں۔ کسی کو اٹھا کر دے پٹکا، کسی کو گردن دبا کر چھوڑ دیا

غرض یہ کہ جتنے گئے تھے وہ تھک کر بیٹھ رہے، اور میدان میں صرف مجسٹریٹ صاحب اور میں رہ گئے، اب میری بھی ہمت بڑھی اور میں نے للکار کر کہا کہ:-

"حرامزادہ مجسٹریٹ اب دیکھ تجھے مجسٹریٹی کا مزہ چکھاتا ہوں، بڑا کلب علی خاں کا باوا بن کر اجلاس پر بیٹھا تھا۔ آج چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا ہو تو میرا نام کتے پر رکھنا نہیں"

یہ کہتے ہوئے میں مجسٹریٹ کی طرف جھپٹا۔ اُدھر سے وہ بڑھا، اِدھر سے میں بڑھا، دونوں دست و گریباں ہو گئے، میں نے اسکی تو تھنی پکڑی، اُس نے میرے منھ پر پنجہ مارا، میں نے انگوٹھا چبایا، اُس نے مجھ کو تاکا میں لگا لیا، اسنے مجھے دے مارا، میرے کپڑوں اور اس کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، دونوں لہو میں تر بتر تھے۔ لیکن نہ میں اُسکی گرفت چھوڑتا تھا اور نہ وہ پیچھے ہٹتا تھا، میں نے دیکھا کہ جتنا وقت گذرتا جاتا ہے میرے قویٰ مضمحل اور میرے ہاتھ پاؤں دیتے جاتے ہیں، اُس خونخوار کتے نے بھی میری کمزوری کو محسوس کر لیا، اور آخری حملہ کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر کے اپنے تئیں میری گرفت سے چھڑا لیا، چھڑانے کے ساتھ ہی اُس نے میری گردن دبائی، میرا سانس گھٹنے لگا، میں نے بڑی مشکل سے ایک چیخ ماری اور چیخ کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی، دیکھتا کیا ہوں کہ میں نیچے پڑا ہوں، اور ڈپٹی کلب علی خاں صاحب میرے سینہ پر سوار میرا ٹینٹوا دبا رہے ہیں انکی داڑھی، اور میری مونچھوں کے کچھ اجزا میں تبادلہ ملکیت ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ عالم خواب میں مجسٹریٹ کے متعلق جو الفاظ میں نے کہے تھے اُن کا مخاطب ڈپٹی صاحب نے اپنے آپ کو سمجھا، اس کے بعد جب میں اٹھ کر جھپٹا تو وہ بھی غصہ میں آپے سے باہر ہو کر میرے لپٹ گئے۔

پھر جو کچھ ہوا وہ ہوا، اسکے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، ہم دونوں کی حالت اُس کا آئینہ تھی۔

میری چیخ سے ڈپٹی صاحب کے چپراسی بھی دالان میں آ گئے اور یہ تماشا دیکھ انگشت بدنداں ہو گئے۔ ایک نے بڑی مشکل سے ڈپٹی صاحب کو مجھ سے علیحدہ کیا، اور وہ یہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے کہ:-

"بازی بازی بار یش بابا ہم بازی"

میں نے کہا کہ:-

ڈپٹی صاحب آپ کو یہ کیا وحشت ہو گئی تھی کہ:-

(یہاں سے پھر صفحات غائب ہیں)

کل کا گھوڑا

جناب اڈیٹر صاحب سالہ نمائش۔

السلام علیکم، آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی نئی پود نے ملک کی بہبودی کیلئے ڈاکہ کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ بنگالہ کی حالت اسکی کھلی ہوئی مثال ہے، اگر یہ اصول صحیح ہے تو میں بھی "بیچ کہیں باقی تو بلی ہی سہی" کے مقولہ پر عمل کرکے اردو کی طرف انگریزی ادب پر ڈاکہ ڈالتا ہوں، لیکن مال کی ہیئت تبدیل کرنے کے لئے بہت کچھ کتر بیونت کر دیتا ہوں، تاکہ شناخت کی وجہ سے ڈاکہ کا الزام عائد نہ ہو سکے، اگر چوری کا مال خریدنے اور نکاسی کرنے کی ہمت ہے تو بسم، نمائش میں کسی جگہ جما دیجئے۔ ورنہ واپس فرما دیجئے خدا کے فضل سے دنیا میں مال مسروقہ خریدنے والوں کا توڑا نہیں مال کھرا ہے نہیں کہیں اور دام کھرے کرونگا، دیکھئے ایک راز کی بات بھی کہے دیتا ہوں، کسی سے کہئے گا نہیں اس مضمون کا کچھ خاکہ جون سنہ ۱۹۰۹ء کے پیرسنز میگزین سے اڑایا گیا ہے، لیکن اضافہ واقعات اور طرز ادا نے دونوں مضمونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے، کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی نہ کہے گا کہ یہ مال فلاں مال کو گلا کر بنایا گیا ہے۔ پیرسنز میگزین بھی اس کے ساتھ بھیجتا ہوں آپ مقابلہ کرکے اپنی عقل کا اندازہ لگا لیجئے۔ والسلام

کمترین مرزا الم نشرح

موجد دنیا میں سیکڑوں ہوئے اور ہوتے چلے آئے ہیں، مگر توبہ توبہ خدا کسی کو میرے دوست مسٹر مور جیسا موجد نہ کرے۔ بندہ خدا کو دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ جب دیکھو اپنے دار التجربہ میں بیٹھے ہیں۔ جب جاؤ اس کو توڑ اس کو جوڑ رہے ہیں، بیٹھے بیٹھے آندھی آجاتی تھی۔ مگر وہ اللہ کا بندہ یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں خیر تو ہے۔ ہزاروں ایجادوں سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ لیکن یہ بھی نہ سمجھے کہ نتیجہ کیا ہے اور دنیا میں ہو کیا رہا ہے، جنگ عظیم میں ان کی بیسیوں ایجادیں کام میں لائی گئیں، لیکن ان کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جنگ کب چھڑی؟ کیوں چھڑی؟ کون جیتا؟ کون ہارا؟ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ اس لڑائی میں بلجیم نے اپنی بساط سے بہت زیادہ ہمت دکھائی، پوچھنے لگے کہ یہ مسٹر بلجیم کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں، بھلا ایسوں کی صحبت سے کسی کا کیا دل بہل سکتا ہے،

میں تو ٹھہرا بیوپاری کہ بیسیوں کے لئے مردے کا کفن بھی اتروا لوں، اور مسٹر مور ٹھہرے ایسے بے پروا کہ اپنی کسی ایجاد کی رجسٹری تک نہ کروائی۔ میں نے کئی دفعہ کہا بھی تو یہی جواب ملا کہ ہر ایجاد عامۂ خلائق کے فائدہ کے لئے ہے، کسی خاص شخص کا حق نہیں ہے، اور نہ پیسے پیدا کرنے کے لئے ہے، ایک دوربین ایجاد کی تھی گھر کے باہر سے گھر کے اندر کا حال دکھاتی تھی، لیکن میرے یار نے اس کی بھی رجسٹری نہ کرائی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کارخانہ نے اپنے نام سے اسکی رجسٹری کرا کے لاکھوں روپیہ کھرے کر لئے، جب میں نے مور سے اس کا ذکر کیا تو وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ اس کارخانہ پر ہرجے کا دعویٰ ہو سکتا ہے، بہرحال مور کی ایجادات دریا کی لہریں تھیں کہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھیں اور بغیر انکو فائدہ پہنچائے اپنی حد تک فنا ہو جاتی تھیں گو دوسرے ان سے پوری طرح متمتع ہوتے تھے۔ اگر باپ دادا نے جائداد نہ چھوڑی ہوتی تو میرے یار کبھی کے محتاج خانہ پہنچا دیئے گئے ہوتے، انکی ذات سے

سب ہی کو فائدہ پہنچتا تھا، نہ پہنچتا تھا تو مجھ کو، کیوں کہ مجھے خبر تک نہ ہوتی تھی کہ ان کی کوئی تازہ ایجاد کب مکمل ہوئی اور کب نذرِ دشمناں ہو گئی، خود مور سے تو اس کی توقع رکھنی ہی فضول تھی کہ وہ اس کا ذکر مجھ سے کرتے۔ اگر حال کھلتا تو اخباروں سے اور "اب پچھتائے کیا ہوت ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" کی مثل ہمیشہ مجھ پر صادق آتی تھی، اگر میری مالی حالت اچھی ہوتی تو میں پروا بھی نہ کرتا، لیکن کاروبار کے مندے اور اکثر بیوپاریوں کی نادہندی نے مجھ کو ٹھک کر دیا تھا، ایسی صورت میں آپ ہی انصاف کیجئے کہ اپنے سچے گرمجوش دوست کے ساتھ مور کی یہ بے اعتنائی قابلِ شکایت ہے یا نہیں، ایک دن میں پریشانی کی حالت میں دفتر سے سیدھا مور کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے دار التجربہ میں کچھ کام کر رہے ہیں، وہیں چلا گیا، اس روز ان کی طبیعت کچھ بشاش معلوم ہوتی تھی، میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر پوچھنے لگے "یہ کیا کتاب ہے" میں نے دہلی کے ایک شاعر میر حسن نے ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اس کا انگریزی ترجمہ ہے، پوچھا مضمون کیا ہے، میں نے کہا یونہی واہی تباہی لکھا ہے، ایک کل کا گھوڑا بنایا ہے، اس پر سوار ہو کر شاہزادہ آسمان پر ہوا خوری کو جایا کرتا تھا، غرض اسی طرح کی بے تکی باتیں ہیں، مجھ سے اتنا سنتے ہی مور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، آنکھیں چمکنے لگیں اور کہنے لگے "ذرا مجھ کو کل کے گھوڑے والا حصہ تو سناؤ" میں نے کتاب میں سے وہ داستان نکالی اور پڑھنا شروع کیا، لیکن پڑھنے میں خلاف فطرت باتوں کے متعلق شاعر کا مذاق بھی اڑاتا گیا۔ میں پڑھ ہی رہا تھا کہ مور نے نہایت غصیلی آواز سے کہا:۔

"او بے ادب خاموش" تجھ جیسا جاہل اس عالی قدر شاعر کو کیا سمجھ سکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر ہی نہ تھا بلکہ بجلی کی قوت اور کل پرزوں کی ترکیب کا بھی پورا ماہر تھا، تم جیسوں کے لئے اس کی باتیں مضحکہ خیز ہوں تو ہوں لیکن سمجھنے

دلیے کے لئے، اس کا نکتہ چراغ ہدایت ہے،" یہ سنکر میں دم بخود ہوگیا کیونکہ ڈرتا تھا کہ یہ حضرت کہیں بجلی کے ایک جھٹکے ہی میں میرے جسم کے ذرات بناکر ہوا میں نہ اڑادیں، اس لئے ٹالنے کے لیے مسکرا کر کہا کہ اگر تم کو یہ کتاب پسند ہے تو میں چھوڑے جاتا ہوں، میرے کسی کام کی نہیں اس سے کیا بہتر ہے کہ میرے دوست کے کام آجائے، مونر نے کتاب میرے ہاتھ سے لی، میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "یار عزیز اس کتاب نے اس وقت دماغ میں ایک خیال پیدا کردیا ہے اسکو میں عملی صورت دینا چاہتا ہوں بس اب آپ اپنے گھر سدھاریں، تو بہتر ہے، اچھا خدا حافظ، اسکی یہ اکھڑی اکھڑی باتیں سنکر بڑی کوفت ہوئی، اور میں دل میں اسکو صلواتیں سناتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

چند روز تک میرا مونر کے پاس جانا نہ ہوسکا۔ ایک دن جو ادھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مونر کے دار التجربہ میں ایک نہایت خوبصورت مشکی گھوڑا ہنہنا رہا ہے، مجھے مونر کے پاس گھوڑا دیکر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ بھلا ایسے شخص کو ایسی چیزوں سے کیا واسطہ میں خود گھوڑوں کا بہت شوقین ہوں، کوئی گھوڑ دوڑ نہیں ہوتی جس میں اپنا کام حرج کرکے نہ جاؤں، اس گھوڑے کو جو دیکھا تو بظاہر جاندار پایا، پاس جاکر تھپکا، سم دیکھے بجھو، زبان دیکھی، جوڑ دیکھے، غرض ہر طرح بے عیب پایا۔ اتنے میں مونر بھی اپنے کسی تجربہ سے فارغ ہوکر میرے پاس آکھڑے ہوئے میں نے پوچھا "یار من گھوڑا کہاں سے مار لائے۔ اور کہاں لاکر رکھا ہے، کہ دار التجربہ میں کیا خون کا امتحان کر رہے ہو یا بجلی سے علاج" مونر نے بڑے زور سے قہقہہ مارا، اور کہا "یار جانی، یہ تو ہی میر حسن کی مثنوی والا گھوڑا ہے، فرق صرف اتنا ہے، اڑ نہیں سکتا، میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شاعر غضب کا دماغ لے کر آیا تھا، پر نے تو میں نے بھی نکال لئے مگر انکو بٹھا نہیں سکتا، خیر آئندہ دیکھا جائیگا،" مجھے مونر کی یہ گفتگو بہت بری معلوم ہوئی

گویا ہم کو اندھا بنا رہا ہے۔ میں اسکو برا بھلا کہتا رہا۔ مگر وہ برابر ہنستا رہا، آخر کہنے لگا کہ "کیا واقعی تم اس کو اصلی گھوڑا سمجھتے ہو!" میں نے کہا اور نہیں تو کیا مٹی کا ہے۔

مور۔ مٹی کا نہیں تو کل کا ضرور ہے،

میں۔ تو کیا میں اندھا ہوں،

مور۔ تو اس کا اندازہ تم خود کر لو،

یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کے ایک پہلو کو دبایا اور پہلو کا پہلو اٹھا کر دوسری طرف الٹ دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑے کے پیٹ میں ہزاروں تار اِدھر سے اُدھر دوڑے ہوئے ہیں، سینکڑوں پرزے اس سرے سے اُس سرے تک بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ بیسیوں مقناطیس اور بیٹریاں جا بجا جمی ہوئی ہیں، یہ دیکھ کر میرے ہوش گم ہوگئے جیسا ذرا سنبھلا تو پوچھا کہ مور کیا واقعی یہ گھوڑا دوڑ سکتا ہے،

مور۔ تو کیا میں نے یہ بچوں کا کھلونا بنایا ہے، یہاں دوڑیگا اور خوب دوڑیگا۔

میں۔ اور اس کی انتہائی رفتار۔

مور۔ اس کا تو میں کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میرے خیال میں کم از کم (۳۰۰) میل فی گھنٹہ ہوگی۔

میں (۳۰۰) میل!

مور۔ ہاں (۳۰۰) میل بلکہ کچھ زیادہ،

یہ سنتے ہی مجھے ٹکے پیدا کرنیکا خیال آگیا، اور سوچا کہ اس گھوڑے سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہیئے، میں نے مور پر ڈورے ڈالنے شروع کئے، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اگر یہ دو تین دوڑیں بھی جیت گیا تو بس میرے ولدر پار ہوگئے،

میں۔ کیوں یار اسے ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں کیوں نہیں دوڑاتے،

مور۔ ڈربی کیا بلا ہے۔

میں نے اس سمجھانا چاہا اگر گھوڑے کا مطلب نہ اسکی سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ آخر تھک کر میں نے اس سے کہا " اچھا یہ تو بتاؤ اسکی رفتار کم زیادہ ہو سکتی ہے،

مور۔ یہ بھی ایک ہی کہی، اگر رفتار کم زیادہ نہ ہو سکے تو پھر ایجاد ہی کیا خاک ہوئی۔

میں۔ خیر یہ تو بتاؤ کہ اس گھوڑے کا تم کرو گے کیا، کیا اچار ڈالو گے،

مور۔ کچھ نہیں کوئی صاحب آکر اٹھا لے جائیں گے پھر نہ گھوڑے کو مجھ سے کچھ کام اور نہ مجھ کو گھوڑے سے کچھ غرض،

میں۔ تو پھر یہ مجھے ہی دے ڈالو،

مور۔ تم ہی لے جاؤ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حق بھی تمہارا ہی ہے، تمہاری ہی کتاب سے یہ پیدا ہوا ہے، اور تم ہی اسکے سب سے زیادہ مستحق ہو، اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں میں نے مور سے اسکے چلانے کی پوری ترکیب سیکھ لی، گھوڑے کو کمرے سے نکالا سوار ہو کر گھر آیا، اور تھان پر باندھ دیا۔ اس کے ایک دو روز بعد میں مور کے پاس گیا۔ اس گھوڑے کا کچھ ذکر بھی چھیڑا۔ لیکن میرے یار کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے ایسا کوئی گھوڑا بنایا بھی تھا یا نہیں۔ چلو گئی گذری بات ہوئی۔

میرا ارادہ ہوا کہ ڈربی سے پہلے اس گھوڑے کو دو تین چھوٹی موٹی دوڑوں میں بھگا لوں تاکہ لوگ اسکی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور ایک دفعہ بھی ایسی بڑی دوڑ میں شریک ہونیکے متعلق کوئی ضابطہ کا اعتراض نہ ہو سکے۔ رجسٹر میں گھوڑے کا اندراج کرنے کے لئے گھوڑ دوڑ کے مہتمم نے اسکا نام دریافت کیا۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی، اور میں اسکے لئے تیار نہ تھا لیکن میری تیزی طبع نے اس مشکل کو آسانی رفع کر دیا، پہلے میں نے اسکا نام "آدم" بتایا، مہتمم نے ماں اور باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا کہ آدم کی پیدائش کیلئے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے، مگر جب انہوں نے ضابطہ کی دفعہ بتائی تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا، آخر سوچتے سوچتے "ایجاد" نام سمجھ میں

آیا "ضرورت" کو ایجاد کی ماں بتایا، اور "تجربہ" کو اسکا باپ، دادا پر دادا اُنکا نام دریافت کیا گیا تو نادر شاہ کے نسب نامہ پر عمل کر کے شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کی بجائے ترقی ابن ترقی کا سلسلہ ستر پشت تک گنوا دیا۔ یہ بیان کافی سمجھا گیا اور "ایجاد" کے نام سے میرے گھوڑے کی رجسٹری بھی ہو گئی،

اب دوسری مشکل چابک سوار کی تھی، سوار ایسا ہونا چاہئے تھا، جسکا نام فہرست چابک سواران میں درج ہو، اور جو لفظ ضمیر اور اسکے مفہوم سے بالکل بے خبر ہو اور ساتھ ہی قابل اعتبار بھی ہو، ظاہر ہے کہ ان صفات کا انسان ملنا آسان نہیں ہے مگر مثل مشہور ہے جوینده یابنده، ایک اللہ کے بندے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکال ہی لیا۔ اسکا نام فہرست میں تو ضرور تھا لیکن مرد میدان نہ تھے دو چار مرتبہ گھوڑ دوڑ میں شریک بھی ہوئے مگر نہایت نا اہلی سے جیتے ہوئے گھوڑے کو ہرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹیوں کو محتاج ہو گئے،

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس کے کھانے کو رزق اور مرنے کو موت نہ ہو، وہ بیچارہ ضمیر اور اسکے پیچیدہ مسائل کی بحث میں کیوں جانے لگا، قصہ مختصر انہوں نے بلا پس و پیش نہایت خوشی سے میری ملازمت قبول کر لی، مجھے ان کی تمام صفتوں میں ان کی خاموشی سب سے زیادہ پسند آئی، اُن کی خاموشی کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصاویر اُن کی خاموشی پر رشک کرتی تھیں، اور بت اس دیوجانس کلبی کے سامنے اُن کا طوطی اور بٹیر معلوم ہوتے تھے،

اُن کا نام تو کلیمنٹس جولیس، آگسٹس جو فرڈی گیرپلیو تھا لیکن اپنی خاموشی کو نبھانے کے لئے صرف اپنا نام "کل" بتایا کرتے تھے، چلو چھٹی ہوئی گھوڑا بھی کل کا، اور چلانے والا بھی مجسم "کل"

میاں بات یہ ہے کہ یہ سب بن پڑے کا سودا ہے، جب قسمت برید ہی ہو جاتی ہے

تو سب شکلیں اپنے آپ کہلتی چلی جاتی ہیں، چند ہی روز میں گھوڑا بھی مل گیا، اور کوڑا بھی مل گیا، اب رہ گئی دوڑ، وہ تو پہلے سے جیتی جتائی رکھی تھی،

غرض اسی طرح دن پر دن گذرتے گئے اور آخر کار گھوڑ دوڑ کا دن آ گیا لیکن اس گھوڑے نے ایسی گمنامی میں پرورش پائی تھی کہ کسی کو کانوں یہ بھی خبر نہ تھی کہ "ایجاد" کیا بلا ہے، کس دم کس کا ہے، اور اس کے جیتنے کی توقع بھی ہے یا نہیں عین گھوڑ دوڑ کے دن صبح کو مورکی پہلی بیوقوفی کا اظہار ہوا۔ شاید اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ زین گھوڑے کی کمر پر کسا جاتا ہے، اگر معلوم ہوتا رفتار بدلنے کی بٹن پیٹھ پر قائم نہ کرتا۔ پہلی رفتار کا تعلق لگام سے رکھا تھا، لیکن بقیہ جس قدر تیز رفتاریاں تھیں اُن کے بٹن آگے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر لگا دیئے تھے، آخر مسٹر کل نے اس معمہ کو حل کیا اور زین بجائے پیٹھ کے "ایجاد" کے پٹھوں پر کس دیا گیا، چونکہ رکابوں کے لئے جگہ نہ تھی اسلئے ان کو سرے سے اڑا ہی دیا، اور مسٹر کل زین پر اکڑوں بیٹھ کر مقابلہ کیلئے میدان میں آ کر داخل ہوئے کہ ان کی سوکھی سوکھی ٹانگوں کے گھٹنے اُن کے کانوں سے اوپر نکل گئے تھے کمر دُہری ہو کر کمان بن گئی تھی، اور وہ گھوڑے کے ہر جھٹکے پر زین سے پھدکتے اور پھر وہیں آ بیٹھتے تھے،

رغبت اور نفرت دیوانگی کی ابتدائی حالتوں کا نام ہے، طبیعت ایک چیز کو بلا وجہ پسند کرتی ہے، اور دوسری کو بلا سبب ناپسند، یہی حالت گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی ہے۔ بعض گھوڑوں کو محض اسوجہ سے پسند کیا جاتا ہے کہ اُن کے باپ دادوں نے یہ کارگزاریاں دکھائی تھیں، اور بعض کو اسلئے نظر سے گرا دیا جاتا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب حضرت آدم کے گھوڑے تک نہیں پہنچتا۔ میرے بچارے گھوڑے کو اس طوفان بے تمیزی میں کون پوچھتا، اس کی حالت بس اس نواب یوجڑ یا راجہ بنارسی کی سی تھی جو پشتنی نوابوں اور راجاؤں کے کسی جلسہ میں آ گیا ہو، کسی نے نظر

اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ گھوڑا ہے یا گھوڑی، گدھا ہے یا خچر جب یہ صورت ہو تو بھلا اس چیز کا کون اندازہ کرنے لگا کہ واقعی یہ گھوڑا ہے بھی یا نہیں البتہ مسٹر کل کے طریقہ نشست کا بڑا خاکہ اڑایا گیا، مگر اس اللہ کے بندے نے یہ بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ فقرے اسپر کسے جا رہے ہیں یا کسی اور پر۔ شرطوں کی یہ حالت تھی کہ بعض گھوڑوں پر ایک کے دو بھی مشکل سے ملتے تھے، مگر "ایجاد" پر ایک ایک کے سو سو دینے پر لوگ تیار تھے، میں نے بھی اپنی جمع پونجی سب اس شرط پر لگا دی، اور نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نتیجہ کا منتظر رہا۔ گھنٹی بجی، جھنڈی گری، اور گھوڑے تیر کی طرح نکلے، مسٹر کل نے یہ ہوشیاری کی کہ ایجاد کو شتر بے مہار نہیں کیا بلکہ اسکو نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا لایا، اور صرف ناک کی پھننگ سے یہ دوڑ جیتی، ہزاروں کے دیوالے نکل گئے اور میں نے صرف ایک دوڑ میں دس لاکھ روپیہ سمیٹ لئے، اس میں سے ایک لاکھ روپیہ تو مسٹر کل کے حصہ میں آئے۔ اور بقیہ نے میری حالت قابل رشک بنا دی تمام دنیا میں اس دوڑ کا چرچا ہو گیا۔ میں اخباروں کے مضامین کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں، اس سے لوگوں کے خیالات کا اندازہ لگ سکے گا

"اخبار گھوڑ دوڑ"

لکھتا ہے "ہمکو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جو گھوڑا گذشتہ دوڑ میں جیتا ہے وہ سلطان روم کی خاص سواری کا تھا۔ اور محض اس کی قوت اور کس بل کا اندازہ کرنے کے لئے تبدیل نام کے ساتھ اسکو اس دوڑ میں شریک کیا گیا تھا۔ ہم نے اپنے قارئین کی اطلاع کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ اس گھوڑے کی نسل کو پوشیدہ رکھنے میں انتہائی کوشش کیجاتی ہے، اور بچہ پیدا ہونیکے بعد ہی ماں اور باپ دونوں کو مار دیا جاتا ہے تاکہ نسل زیادہ نہ بڑھے، یہ اب تک پتہ نہ چلا کہ ان گھوڑوں کا جنگل صحرائے عرب کے کس حصہ میں واقع ہے۔ البتہ یہ ضرور معلوم

ہوچکا ہے کہ جتنے سائیس اور سوار اس جنگل میں ہیں ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں اور زبانیں کاٹ لی گئی ہیں، تاکہ کسی کو اس جنگل کی بابت وقوع معلوم نہ ہو سکے۔ آئندہ جو مزید حالات ظاہر ہونگے وہ ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے پیش کئے جائینگے

اقتباس از اخبار پنچ

محققین زبان کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوگی کہ "دم پرندہ باندھنے" اور "دم دبا کر بھاگنے" کے محاوروں کی اصلیت کو گذشتہ گھوڑ دوڑ میں ایک نئے گھوڑے "ایجاد" نامی نے ظاہر کر دیا۔

ان دونوں محاوروں کا مفہوم ہمیشہ "بے تحاشا بھاگنا" لیا جاتا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دم پرندہ باندھنے یا دم دبانے سے رفتار میں تیزی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے، اس گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" کے زین کا نمدہ یعنی عرق گیر بجائے کمر پر رکھنے کے اسکے پٹھوں پر رکھا گیا، اور واقعی اس طرح اسکی دم پرندہ بھی آگیا، اور دم دب بھی گئی، اس گھوڑے کا ایسی بڑی دوڑ جیتنا اس کی تیز رفتاری کا بین ثبوت ہے، ہم اس گھوڑے کے مالک کو ان کی کامیابی پر مبارکباد بھی دیتے ہیں اور لغات کے اہل فن کی جانب سے شکریہ بھی ادا کرتے ہیں، کہ ان کے گھوڑوں کی بدولت بآسانی دو پیچیدہ محاوروں کی تشریح ہوگئی ہے۔

"مقالہ افتتاحیہ اخبار سائنس"

"رواج اور قدامت پسندی ہمیشہ مانع ترقی رہے ہیں، لیکن بلحاظ اپنی قدامت کے کوئی ایسا رواج ہماری نظر سے نہیں گذرا، جو گھوڑوں پر زین کسنے کے پرانے طریقہ کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ پر جہاں تک نظر ڈالی جاتی ہے، اور پرانے

کتبوں، تصویروں اور مجسموں کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے، یہی پتہ چلتا ہے کہ زین یا بیاک جامہ ہمیشہ گھوڑوں کی پیٹھ ہی پر ڈالا گیا ہے۔ لیکن اصول سائنس سے اگر اس طریقہ عمل کو دیکھا تو یقیناً پہلی ہی نظر میں یہ بالکل خلاف فطرت معلوم ہوگا، گھوڑے کی بناوٹ ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیٹھے بوجھ سہارنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ نہ کہ اگلی ٹانگیں اگر فطرت کا یہ تقاضہ ہوتا کہ پیٹھ پر بوجھ قائم کیا جائے تو گھوڑے کے اگلے اور پچھلے پیر دونوں کی وضع ایک ہی ہوتی تاکہ بوجھ ان چاروں حصوں پر برابر تقسیم ہو جائے لیکن گھوڑے کی ساخت زبان حال سے بتا رہی ہے کہ اس کے پچھلے پیروں پر بوجھ ڈالو اور اگلے پانو رفتار کے لئے چھوڑ دو۔

خود چوپاؤں کے بھاگنے کے طریقہ پر اگر سائنس کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے، تو یہ مسئلہ اور بھی آسانی سے حل ہو جاتا ہے، جانور کی چاروں ٹانگیں اگر آگے کو جھکیں گی تو ہمیشہ رفتار میں تیزی پیدا ہوگی۔ اس اصول کو اب واقعات سے منطبق کیجئے۔ جانور کی پیٹھ پر بوجھ رکھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں تو ضرور آگے کو جھک آتی ہیں، لیکن اسکے ساتھ ہی اس کے اگلے پیر بجائے آگے جھکنے کے پیچھے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس سے یقیناً رفتار پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے ہمارے زیر غور تھا، لیکن ہم اس پر کچھ لکھنے کی ہرگز جرأت نہ کرتے اگر گذشتہ گھوڑ دوڑ میں "ایجاد" نے اس اصول کو عملاً ثابت نہ کر دیا ہوتا۔ کیونکہ قدیم رواج کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مفت کی لڑائی مول لینا ہے، ہم کو امید ہے کہ اب قدامت پسند لوگوں کی آنکھیں سائنس کا عملی تجربہ دیکھنے کے بعد کھلیں گی اور آئندہ گھوڑ دوڑ میں ہم رواج کے مقابلہ میں سائنس کی فتح کو اس شکل میں دیکھیں گے کہ بجائے پیٹھ کے سب گھوڑوں کے پٹھوں پر زین کسے ہوں گے۔

غرض خدا خدا کر کے ایک ہی گھوڑ دوڑ میں میری مالی حالت درست ہو گئی"

لیکن اب یہ مصیبت آپڑی کہ جو سہولتیں "ایجاد" کی گمنامی کی وجہ سے تھیں وہ جاتی رہیں، اور اب لوگوں پر یہ ظاہر کرنا پڑا کہ یہ کھاتا، پیتا، ہگتا، موتتا ہوا گھوڑا ہے، یہ کام ظاہر مشکل تھا مگر میری جدّتِ طبع نے اسکو بھی آسان کردیا۔ ایک اسی کے قد و قامت رنگ ڈھنگ وضع قطع کا گھوڑا راتوں رات خرید لایا، اصلی گھوڑے کو تھان پر باندھ دیا اور نقلی کو ایک کمرہ میں بند کردیا، بڑے بڑے ماہرانِ فن آتے اور گھوڑے کو دیکھکر حیران رہ جاتے کہ اس میں تو کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جو اتنی بڑی گھوڑدوڑ اسکو جتوا سکے، نہ تو جوڑ ہی مضبوط ہیں اور نہ بناوٹ ایسی سبک ہے۔ پھر اس قیامت کی رفتار اس میں پیدا ہوگی تو کہاں سے پیدا ہوگئی، غرض جتنے منھ اتنی باتیں، ہر شخص اپنی اپنی ہانکتا تھا، مگر اس عقدہ کو کوئی نہ کھول سکتا تھا۔ آخر ہوتے ہوتے دوسری گھوڑدوڑ کا دن آگیا۔ رات ہی کو نقلی اصطبل میں اور اصلی کمرہ میں منتقل کردیا گیا۔ اور میں اور مسٹر کل گھوڑے لیکر عین وقت پر میدان میں پہنچے، کیا دیکھتا ہوں کہ جتنے گھوڑے دوڑنے والے ہیں سب ایک قطار باندھے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے حساب داں تقسیم وزن کا لحاظ کرکے ناپ ناپ کر ان کے پٹھوں پر زین بندھوا رہے ہیں۔ غرض یہ مشکل بھی آسان ہوئی، اور گھنٹہ بجتے ہی سب گھوڑ دوڑ کے لئے ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ اُدھر جھنڈی گری اور اِدھر سواروں کے گھوڑوں کے چابک رسید کئے۔ چابک مارنا تھا کہ قیامت بپا ہوگئی، ماسٹ ولیتوں اور شیتکوں کے گھوڑوں نے سواروں کی جانیں ہلادیں۔ بعض تو ڈر کر کود گئے۔ بعض ہمت والے تھے وہ جھٹکے جھیلتے رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں تماشائیوں کے سرو ں اور کندھوں پر گٹھریوں کی شکل میں نظر آئے۔ ایک "ایجاد" تھا کہ وہ اول آخر سب ہی کچھ رہا۔ چونکہ اس دوڑ میں لوگوں نے ذرا سمجھ بوجھ کر روپیہ لگایا تھا اسلئے میری آمدنی بھی کچھ زیادہ نہ ہوئی۔ پھر بھی ستر اسی ہزار میں نے بنا ہی لئے۔

اس واقعہ کے متعلق اخباروں میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں سے بعض کا

اقتباس ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے ۔

"اخبار گھوڑدوڑ"

ہم کو سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ علاقۂ نجد کے کسی نامعلوم مقام پر دو ہوائی جہازوں پر گولیاں برسائی گئیں جس کی وجہ سے وہ نیچے اتر نے پر مجبور ہوئے، دونوں جہازوں میں جتنے لوگ سوار تھے ان سب کو نہایت بیدردی سے ذبح کر دیا گیا ، معلوم ہوتا ہے کہ اسی مقام کے آس پاس کہیں سلطان روم کے خاصہ کے گھوڑوں کا جنگل ہے ورنہ بلاوجہ جہازوں پر گولیاں چلانے اور اُن کی سواریوں کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی ، امید ہے کہ گورنمنٹ اس اہم معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر صدیوں کے راز کا انکشاف کرے گی "

تیج میں ایک نہایت مختصر سا مضمون تھا کہ " اس مرتبہ گھوڑوں کی دموں پر نمدہ باندھا گیا تھا ۔ مگر بدقسمتی سے دوڑ کے وقت بہت سے سواروں کے چوتڑوں پر نمدہ بندھ گیا اور اکثر سواروں میں اتنی تیزی آگئی کہ وہ اپنے زور میں اچھل اچھل کر گھوڑوں کی گردنوں سے آگے نکل گئے "

اخبار سائنس کا مضمون بہت عالمانہ تھا اُس نے روح پر بحث کر کے لکھا تھا کہ ماہران فن علم حیوانات اس وقت تک قائل نہ تھے کہ انسان اور حیوان دونوں میں ایک ہی قسم کی روح ہوتی ہے اور اسی لئے حیوانوں میں بھی روح اور قدامت پسندی اسی طرح جاری اور ساری ہے جس طرح انسانوں میں ہے ۔ اس مسئلہ کا تصفیہ گذشتہ گھوڑدوڑ نے نہایت اطمینان بخش طریقہ پر کر دیا اور اب کسی کو اسکے خلاف زبان ہلانے کی گنجائش نہیں رہی ۔ رواج قدیم کے خلاف اگر اعلیٰ سائنٹفک اصول کے موافق اس گھوڑدوڑ میں زین بجائے پیٹھ پر کسنے کے گھوڑوں کے پیٹوں پر کسا گیا تھا

گو اس طریقۂ عمل سے ان جانوروں کو زیادہ آسائش و سہولت تھی لیکن رواج قدیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہوں نے بطور احتجاج دولتیاں جھاڑنا اور ٹکریں مارنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان گھوڑوں کی بیوقوفی کے باعث بجز "ایجاد" نامی گھوڑا جو اصول سائنس کو سمجھتا اور اپنی آسائش کا احساس رکھتا تھا، بازی لے گیا۔ لیکن وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب یہ جانور بھی اپنی ضد سے باز آئیں گے اور اپنی قدامت پسندی کو اس طرح ترک کر دیں گے جس طرح گذشتہ گھوڑ دوڑ کے بعد سے انسانوں نے ترک کر دیا ہے۔

اب ڈربی کا نازک زمانہ قریب آ گیا اور "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت چڑھنا شروع ہوئی تو بہت یہاں تک پہنچی کہ روپے پر ایک آنہ بھی کوئی دینے پر تیار نہ تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک دوسرے خلجان میں پڑ گیا۔ جو لوگ گھوڑ دوڑ کے فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک گھوڑے کے نکل جانے سے شرطوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے بعض بے ایمان لوگ ایسے نکل آتے ہیں جو گھوڑوں کو زہر دینے یا اصطبل کو بم سے اڑا دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ باوجود میری حفاظتی تدابیر کے ایک روز رات کے بارہ بجے میرا اصطبل مع اصلی گھوڑے کے بم سے اڑا دیا گیا۔ اور بیچارے ناکردہ گناہ کے چھیچھڑے اور کھال کے ٹکڑے کئی کئی میل کے فاصلہ پر پائے گئے۔ لیکن شکر ہے کہ میرا "ایجاد" اس حملہ سے محفوظ رہا، اور دوسرے ہی دن صبح کو اس واقعہ کا حال اخباروں میں بڑے بڑے موٹے حرفوں میں چھپ گیا، اور چھپنے کے ساتھ ہی "ایجاد" کے ٹکٹوں کی قیمت گر گئی، میرے لئے یہ "خدا شرے برانگیزد کہ خیرِ ما درآں باشد" کا مصداق ہو گیا۔ اور میں نے دل کھول کر ٹکٹ خریدنا شروع کئے، ہزاروں تار خریدنے کے آئے مگر میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا، لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ میں مرے ہوئے گھوڑے کے ٹکٹ کیوں خرید رہا ہوں۔ لوگوں میں بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں، اور آخر انہوں نے پتہ چلا لیا کہ "ایجاد" میرے سونے کے کمرے میں صحیح سلامت

موجود ہے۔"

ڈربی سے ایک دن پہلے میں اور مسٹر کل اپنے کمرہ میں کھڑے گھوڑے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ سامنے کی کھڑکی میں سے پستول چلا اور گولی "ایجاد" کے پہلو میں لگ کر آر سے پار ہوگئی میں کھڑکی سے کود کر اس شخص کے پیچھے بھاگا، لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔ پولیس میں اطلاع دینا گویا اپنا راز کھول کر خود کو تباہ کر لینا تھا، اس لئے خاموشی اختیار کی۔ واپس آ کر میں نے اور مسٹر کل نے "ایجاد" کے پرزوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ لیکن کوئی خرابی نظر نہ آئی اور ہم نے "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا ورد کرتے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں "ایجاد" کے مالک کی حیثیت سے تو تمام دنیا میں مشہور ہو گیا تھا، لیکن دل چاہتا تھا کہ "ایجاد" پر سوار ہو کر اور خود ڈربی جیت کر اپنی شہرت کو چار چاند لگا دوں۔ اس لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرتبہ تو میں ہی اس پر سوار ہونگا مسٹر کل نے منع بھی کیا لیکن میں نے ایک نہ مانی اور صبح ہی سے تیاری شروع کر دی۔

ڈربی کے میدان میں پہنچا تو دل بہت سے کانپ گیا جہاں تک نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے خود بادشاہ سلامت بھی مع خاندان شاہی کے رونق افروز تھے تمام گھوڑے یکے بعد دیگرے ان کے سامنے سے گذارے گئے جب "ایجاد" میدان میں آیا تو تالیوں کی آواز سے آسمان گونج گیا۔ میں نے بھی خراماں خراماں گھوڑے کو میدان کا چکر دیا۔ اور سب گھوڑوں میں ملا کر کھڑا کر دیا۔ گھنٹہ بجا۔ جھنڈی گری اور سب گھوڑے آناً ہی کیطرح اڑاں ہو لئے۔ مگر "ایجاد" نے تماشہ کرنا شروع کیا۔ ایک تو غصہ دوسرے شرمندگی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پورے زور سے تیز رفتاری کا بٹن دبا دیا جس وقت بٹن دبایا تو اسکے منہ کی بجائے اسکی پیٹھ میدان کی طرف تھی، میری حیرت کی کچھ انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ "ایجاد" نے پوری رفتار کے ساتھ الٹے پاؤں بھاگنا شروع کیا، معلوم ہوتا ہے کہ رات والی گولی نے لگام والی رفتار کے پرزے کو تو کوئی ضرر نہیں

پہنچایا تھا۔ مگر تیز رفتاری کے پرزوں کے عمل کو بالکل بدل دیا تھا۔ میں نے گھوڑے کو روکنا چاہا، تو پسینے چھوٹ گئے کیونکہ میرے زور سے دبانے کی وجہ سے بٹن دب کر ٹوٹ گیا تھا اب کیا تھا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے گھوڑوں کو جا لیا اور آنِ واحد میں ان سے آگے نکل گیا۔ گو یہ گھوڑے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر میرے الٹی رفتار کے باعث پیچھے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور گو میں پیچھے ہٹ رہا تھا لیکن دراصل ان سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ لوگوں کے قہقہوں اور تالیوں نے صور اسرافیل کی صورت پیدا کر لی اور بعض سواروں کو ہنسی کی وجہ سے اپنے گھوڑوں کو روکنا پڑا۔ واقعہ کے بیان کرنے میں عرصہ لگا ہے لیکن خود یہ واقعہ شروع ہوا اور آناً فاناً میں ختم ہو گیا۔ اور ڈربی کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ جیتنے میں کسی گھوڑے کا حساب سر کی لمبائی سے لگانے کی بجائے دُم کی لمبائی سے لگانا پڑا۔

اب مشکل یہ آ پڑی کہ گھوڑا نہ اب رکتا ہے نہ جب میدان کو عبور کر کے باڑ توڑتا ہوا تماشائیوں میں گھس گیا۔ جدھر نکل گیا کائی سی پھٹ گئی۔ بھیڑ چھٹ گئی اور میدان صاف ہو گیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔ رفتار ایسی تیز تھی کہ کودنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک خالی موٹر کھڑی ہے۔ جب گھوڑا اس کے پاس نکلا میں اللہ کا نام لے کر دھم سے موٹر میں کود پڑا۔ اب رہے میاں "ایجاد" تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ البتہ دوسرے روز کے اخبار میں ہوائی خبر سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ایک گھوڑا الٹا تیرتا ہوا افریقہ کے جنوبی کنارے پر دیکھا گیا۔ اخبار گھوڑ دوڑ کا خیال ہے کہ فطرتاً اس کو اپنے مسکن کی طرف لے جا رہی ہے لیکن پنچ کی رائے ہے کہ جب تک اس کی دُم پر نمدہ بندھا رہے گا اس کی رفتار کم نہ ہو گی۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ دونوں میں کون سچا ہے۔ میرے چوٹ تو آئی مگر سمجھا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ لنگڑے ہو گئے تو کیا ہرج ہے، ڈربی تو جیت لی۔ بڑھیا مری تو مری آگرہ تو دیکھ لیا۔

ہم اور ہمارا امتحان

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم ۔ ذوق مرحوم فرما گئے ہیں :-

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

بعض انسان دنیا کے تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور بعض روشن پہلو کو۔ ایک ہی چیز ایک کو بری معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو اچھی۔ امتحان ایک کے لئے آفت جان ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے دلفریب۔ انہی دو رخوں کو دو صاحبوں نے اپنی اپنی سرگزشت میں دکھایا ہے اس کے روشن رُخ کا کچھ حصہ رسالہ افادہ میں چھپا تھا۔ مگر وہ رسالہ کے حق میں غالب کا قصیدہ ہو گیا۔ اور اسکی اشاعت کے ساتھ ہی رسالہ افادہ کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

اب یہ دونوں رُخ رسالہ نمائش کے لئے بھیجتا ہوں۔ دونوں کو ایک ہی پرچہ میں چھپا دیجئے۔ اگر آپ کے رسالہ کا حشر بھی اسکی نحوست سے کہیں وہ نہ ہو جو رسالہ افادہ کا ہوا۔ اگر چھاپنے کی ہمت نہ ہو مضمون واپس کر دیجئے۔ جو ایڈیٹر صاحب اپنے رسالہ کی بنیاد کو بہت قوی سمجھتے ہیں انکو بھیجدونگا۔ دیکھوں وہ بھی اس ٹکر کی تاب لاتے ہیں یا نہیں۔

والسلام (مرزا الم نشرح)

تصویر کا ایک رُخ

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی

لوگ امتحان کے نام سے گھبراتے ہیں لیکن مجھے ان کے گھبرانے پر ہنسی آتی ہے، آخر امتحان ایسا کیا ہوتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں "فیل یا پاس"۔ اس سال کامیاب نہ ہوے آئندہ سال سہی۔ میں اپنے دوستوں اور ہم جماعتوں کو دیکھتا تھا کہ جوں جوں امتحان کے دن قریب آتے جاتے ان کے حواس پراں۔ ان کا دماغ مختل اور ان کی صورت اتنی سی نکل

آتی تھی۔ بندۂ درگاہ پر امتحان کا نہ رتی برابر اثر پہلے تھا۔ اور نہ اب ہے، گو امتحان سے فارغ ہو چکا ہوں لیکن اب بھی اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہے، امیدواروں کا مجمع نئی نئی صورتیں عجیب عجیب خیالات۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے کبھی دل سیر نہیں ہو سکتا جی چاہتا ہے کہ تمام عمر امتحان ہوئے جائے۔ لیکن پڑھنے اور یاد کرنے کی شرط اٹھا دی جائے میری سنئے کہ دو سال میں لا کلاس کا کورس پورا کیا۔ مگر کس طرح؟ شام کو یاروں کے ساتھ ٹہلنے نکلتا۔ واپسی کے وقت لا کلاس میں بھی جھانک آتا۔ منشی صاحب دوست تھے اور لیکچرار صاحب پڑھانے میں مستغرق حاضری کی تکمیل میں کچھ دشواری نہ تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہ لا کلاس میں شریک ہونے سے میرے کس مشغلہ میں فرق آ سکتا تھا؟ والد صاحب قبلہ خوش تھے کہ بیٹے کو قانون کا شوق ہو چلا ہے کسی زمانہ میں بڑے بڑے وکیلوں کے کان کترے گا۔ ہم بھی بے فکر تھے کہ چلو دو برس تک تو کوئی محنت کے لئے کہہ ہی نہیں سکتا۔ بعد میں دیکھئے کون جیتا ہے اور کون مرتا ہے، لیکن زمانہ آنکھ بند کئے گذر جاتا ہے، دو سال ایسے گذر گئے جیسے ہوا۔ لا کلاس کا صداقت نامہ بھی مل گیا۔ اب کیا تھا۔ والدین امتحان وکالت کی تیاری کے لئے سر ہو گئے مگر میں بھی ایک ذات شریف ہوں۔ ایک بڑھیا اور ایک بڈھے کو دھوکا دینا کیا بڑی بات ہے میں نے تقاضا کیا کہ علیحدہ کمرہ مل جائے تو محنت کروں۔ بال بچوں کی گڑبڑ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا چند روز اسی حیلے سے ٹالدیئے، لیکن تابکے! بڑی بی نے اپنے سونے کا کمرہ خالی کر دیا۔ اب میں دوسری چال چلا، دروازوں میں شیشے تھے ان پر کاغذ چپکا دیا۔ لیمپ روشن کر کے آرام سے سات بجے سے سو جاتا اور صبح نو بجے اٹھتا اگر کسی نے آواز دی اور آنکھ کھل گئی تو ڈانٹ دیا کہ خواہ مخواہ میری پڑھائی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔ اگر آنکھ نہ کھلی اور صبح کو سونے کا الزام لگایا گیا؛ تو کہدیا کہ میں پڑھتے وقت کبھی جواب نہ دونگا۔ آئندہ کوئی مجھے دق نہ کرے بعض وقت ایسا ہوا کہ لیمپ بھڑک کر

چمنی سیاہ ہوگئی۔ اور میری زیادہ محویت و محنت کا نتیجہ سمجھی گئی بعض وقت والد والدہ کہتے بھی تھے کہ اتنی محنت نہ کیا کرو۔ لیکن میں زمانہ کی ترقی کا نقشہ کھینچ کر اُن کا دل خوش کر دیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل بھی آسان ہوگئی۔ اور امتحان کا زمانہ قریب آیا، میں نے گھر میں بہت کہا کہ ابھی میں امتحان کے لئے جیسا چاہئے ویسا تیار نہیں ہوں لیکن میری مسلسل حاضری لاکلاس اور شبانہ روز کی محنت نے اُن کے دل پر سکہ بٹھا رکھا تھا، وہ کب ماننے والے تھے، پھر بھی احتیاطاً اپنے بچاؤ کے لئے اُن سے کہدیا کہ اگر میں فیل ہوجاؤں تو اسکی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو ابھی امتحان کے قابل نہیں پاتا لیکن والد صاحب گرا کر بولے کہ امتحان سے کیوں ڈرے جاتے ہو، جب محنت کی ہے تو شریک بھی ہوجاؤ کامیابی و ناکامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔

ع ۔ مرد باید کہ ہراساں نہ شود

میں نے بھی تقدیر اور تدبیر پر ایک چھوٹا سا لیکچر دیکر ثابت کر دیا کہ تدبیر کوئی چیز نہیں تقدیر سے تمام دنیا کے کام چلتے ہیں:۔

قصہ مختصر درخواست شرکت بھیجی گئی اور منظور ہوگئی۔ اور ایک دن وہ آیا کہ ہم ہال ٹکٹ لئے ہوئے مقام امتحان پر پہنچ ہی گئے۔ گو یاد نہیں کیا تھا لیکن دو وجہ سے کامیابی کی امید تھی "اول تو امداد غیبی" "دوسرے پرچوں کی الٹ پھیر" شاید وہ حضرات جو امتحان میں کبھی شریک نہیں ہوئے اس مضمون کو نہ سمجھیں۔ اس لئے ذرا وضاحت سے عرض کرتا ہوں "امداد غیبی" سے مراد امیدواران امتحان کی اصطلاح میں وہ مدد ہے جو ایک کو دوسرے سے یا کسی نیک ذات نگران کار سے یا عندالموقع کتاب سے پہنچ جاتی ہے پرچوں کی الٹ پھیر گو بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن تقدیر سب کچھ آسان کر دیتی ہے بعض شریف کم حیثیت لازم ایسے بھی نکل آتے ہیں جو بامید انعام پرچہ بدل دیتے ہیں مگر فرق ہے کہ اس سے ایک محنت کرنے والے کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ لیکن تدبیر و تقدیر کا مسئلہ جیسا

اس کارروائی میں حل ہوتا ہے۔ دوسری کسی صورت میں حل نہیں ہوتا اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں لیکن وہ بہت کم پیش آتی ہیں۔ اسلئے اُن پر بھروسہ کرنا نادانی ہے۔ خیر آمدم برسرِ مطلب! پونے دس بجے گھنٹی بجی اور ہم بسم اللہ کہکر کمرۂ امتحان میں داخل ہوئے یہاں ایک بہت خلیق اور ہنس مکھ نگرانکار تھے مجھے جگہ نہیں ملتی تھی۔ میں نے ان سے کہا وہ میرے ساتھ ہولئے۔ جگہ بتائی اور بڑی دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے میں سمجھا چلو بیڑا پار ہے۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

ٹھیک دس بجے پرچہ تقسیم ہوا۔ میں نے پرچہ لیا۔ سرسری نظر ڈالی اور میز پر رکھدیا لیکن یہ ضرور کہونگا کہ پرچہ پڑھنے کے بعد جیسا میرے چہرے پر اطمینان تھا۔ شاید ہی کسی کے چہرے پر ہوگا۔ خود تو اس پرچہ کے متعلق اندازہ نہ کرسکا لیکن نگرانکار صاحب کو یہ کہتے ضرور سُنا کہ یہ پرچہ مشکل ہے۔ میں کئی مرتبہ اول سے آخر تک اسکو پڑھ گیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کس مضمون کا ہے جوابات کی کاپی دیکھی۔ اس کے آخر کی ہدایتیں پڑھیں صفحہ اول کی خانہ پوری کی اور کھڑا ہوگیا۔ گارڈ صاحب فوراً ہی آئے میں نے اُن سے کہا کہ جناب یہ پرچہ کس مضمون کا ہے، وہ مسکرائے زبان سے تو کچھ نہ بولے مگر پرچہ کے عنوان پر انگلی رکھدی اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ "اُصول قانون" کا پرچہ ہے دل کھل گیا۔ اب کیا تھا۔ میں نے بھی قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کردیا۔ کیونکہ اصول کے لئے کسی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت تو ہے ہی نہیں۔ اس مضمون پر ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ ایک مقنن ایک اصول قائم کرتا ہے دوسرا اسکو توڑ دیتا ہے کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی رائے کو کسی دوسرے کی تجویز کا پابند کریں۔ میں نے اپنے برابر والے سے پوچھنے کی کوشش بھی کی کچھ اِدھر اُدھر نگاہ بھی دوڑائی۔ مگر گارڈ صاحب میری حالت کو کچھ ایسا تاڑ گئے تھے کہ ہر وقت بلائے ناگہانی کی طرح سر پر ہی کھڑے رہتے تھے، ذرا میں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری اور انہوں نے آواز دی کہ "جناب اپنے پرچہ پر نظر رکھیے"

جب دوسروں سے مدد ملنے کی توقع منقطع ہوگئی، تو میں نے دل میں سوچا کہ چلو ان گارڈ صاحب ہی سے پوچھیں۔ میں کھڑا ہوگیا۔ وہ آئے میں نے دریافت کیا کہ "جناب اس دوسرے سوال کا کیا جواب ہے" وہ مسکرائے اور کہا کہ "مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا کہ یہ برابر والے بڑے زور سے لکھ رہے ہیں ان سے پوچھ دیجئے۔ اور اگر آپ کو دریافت کرتے ہوئے لحاظ آتا ہے تو ذرا ادھر ٹہلتے ہوئے تشریف لیجائیے میں خود پوچھ لونگا۔ مگر وہ کب ملنے والے تھے۔ قطب ہو گئے ان کا مسکرانا پہلے تو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر آخر میں تو زہر ہوگیا۔ میں واللہ سچ کہتا ہوں کہ اگر تمام عمر میں قلبی نفرت مجھے کسی سے ہوئی ہے تو انہی صاحب سے ہوئی ہے، ان کا وہ مسکراتے ہوئے ٹہلنا مجھے ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ اگر میرے برابر کھڑے ہو کر یہ مسکرائے تو ضرور گلے جب ہو جاؤں لیکن پھر سوچا کہ سرکاری معاملہ ہے کہیں یہ جھگڑا چھوڑ کر گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں، اس لئے چپکا ہو رہا۔ غرض اس طرح یہ تمام دن امتحان کے گذر گئے۔ لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ظالم کے ساتھ ایسی حالت میں کہ ایک حرف بھی یاد نہ ہو یہ چھ گھنٹے گزارنے کیسے مشکل ہوں گے، میں تو ہر روز آدھ گھنٹہ کے بعد ہی کمرے سے نکل آتا۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ والد صاحب روز گیارہ بجے سے آجاتے اور نیچے صحن میں بیٹھے رہتے اب میں جلدی باہر آجاتا تو جو رعب میں نے دو سال کے عرصہ میں قائم کیا تھا وہ سب ہوا ہو جاتا۔ اس لئے قہر درویش، بر جانِ درویش۔ آخری وقت تک کمرۂ امتحان میں بیٹھا رہتا اور جب نیچے اترتا تو والد صاحب پرچے کی سختی کی ضرور شکایت کرتا۔ وہ بھی میری تشفی کے لئے ممتحن کو بہت کچھ برا بھلا کہتے۔ لیکن انکو یہ خیال ہو گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرا بیٹا کامیاب ضرور ہوگا امتحان ختم ہوا۔ اور امید نمبر ایک اور دو کا خون ہو گیا۔ اب ممتحنوں کے پاس کوشش کی سوجھی والد صاحب ایک نہ ہر دست چٹھی سفارش کی لیکر ایک صاحب کے یہاں پہنچے وہ چٹھی دیکھ کر بہت اخلاق سے ملے آنکی وجہ دریافت کی۔ والد نے عرض کیا کہ خادم زادہ اس سال امتحان

میں شریک ہوا ہے اگر آپ کوشش فرمائیں تو یہ خانہ زاد ہمیشہ ممنون احسان رہیگا۔ وہ بہت ہنسے اور دوسرے لوگوں سے جو سلام کو حاضر ہوئے تھے فرمانے لگے، یہ عجیب درخواست ہے! ان کا بیٹا تو امتحان دے اور کوشش میں کروں۔ بندۂ خدا اپنے لڑکے سے کہو کہ وہ خود کوشش کرے بیچارے بڑے میاں ایسے نادم ہوئے کہ پھر کسی کے پاس نہ گئے، کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ بھی شائع ہوگیا اور کمترین جملہ مضامین میں بدرجۂ اعلیٰ فیل ہوا۔ خبر نہیں کہ وہ کونسے بھلے مانس ممتحن تھے کہ انہوں نے دو نمبر بھی دیئے، باقی نے تو صفر ہی پر ٹالا۔ والد صاحب کو بہت رنج ہوا نمبروں کی نقل حاصل کی، اور بالآخر یہی رائے قرار پائی کہ کسی بدمعاش چپراسی نے پرچے بدل دیئے ورنہ ممکن تھا کہ برابر تین گھنٹے لکھا جاتا اور صفر ملتا۔ مجھے بھی تعجب تھا کیونکہ میں نے پرچے کچھ ایسے برے نہیں کئے تھے، فیصلہ کے دو پرچوں کے جوابات تو مجھے کچھ یاد ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے پیش کرکے ان سے انصاف کا طالب ہوں۔ بقیہ پرچوں کے متعلق تو مجھے خود یاد نہیں رہا کہ سوال کیا تھا۔ اور میں نے جواب کیا لکھا۔ لیکن میرے فیصلہ سے دوسرے جوابات کا اندازہ ہو جائیگا۔ فیصلہ دیوانی میں یہ مقدمہ دیا گیا تھا کہ ایک مکان گروی ہے مرتہن کہتا ہے کہ مکان رہن بالوفا تھا۔ مدت ختم ہوگئی اس لئے مکان اب میرا ہوگیا۔ راہن کہتا ہے کہ مرتہن کا قبضہ غاصبانہ ہے دونوں طرف سے شہادت پیش ہوئی ہے۔ مرتہن کے گواہوں کے بیانات سے میری رائے میں رہن بالوفا ثابت تھا۔ اور راہن کی شہادت سے قبضۂ غاصبانہ۔ میں نے اسکا تصفیہ یہ کیا کہ مکان منہدم کر کے زمین اور عملہ آدھا آدھا دونوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اور چونکہ یہ تمام خرابی گواہوں کے پیچیدہ بیانات سے پڑی ہے اس لئے مکان کے منہدم کرنے اور مقدمہ کا خرچہ ان سے دلایا جائے۔ میں اب بھی نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ صاف کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ نہ مرتہن کو شکایت کہ میرا مقدمہ خارج ہوا۔ اور نہ راہن کو شکایت کہ اسکا مکان مفت میں دوسروں کو دیدیا گیا۔ اب اس فیصلہ پر بھی اگر ممتحن صاحب نمبر نہ دیں تو وہ جانیں

اور ان کا دین ایمان جانے۔

فوجداری مقدمہ کی یہ صورت تھی کہ ایک جوان عورت کے خاوند کو ملازم نے مار ڈالا تھا۔ بیچاری کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ شہادت میں جو گواہ پیش ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے ملزم کو قتل کرتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ ایک بیان کرتا ہے کہ اُس کا منہ شمال کیطرف تھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا منہ جنوب کی طرف تھا۔ ذرا انصاف کیجئے کہ جب یہ صورت ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ان دونوں کی پیٹھ ملزم اور مقتول کی طرف تھی، اول تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا بڑا واقعہ ہو رہا ہو اور یہ لوگ پیٹھ پھیرے کھڑے رہیں۔ دوسرے جب یہ پیٹھ پھیر کر کھڑے تھے تو کیا ان کی پیٹھ پر آنکھیں تھیں جو انہوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ اس لیئے میں نے یہ تجویز کی کہ ان دونوں گواہوں کو دو دو سال سزائے قید با مشقت اور سو سو روپیہ جرمانے کی سزا دے کر ملزم کو بری کر دیا اس کے بعد میں نے دیکھا کہ بیچاری مستغیثہ بیوہ ہو گئی۔ اس لیئے اسکے متعلق یہ حکم دیا کہ سرکاری طور پر مستغیثہ کا نکاح ملزم سے کر دیا جائے اور جو رقم جرمانہ گواہوں سے وصول ہو وہ اس نکاح میں صرف کیجائے، اب رہے بچے تو ان کے متعلق یہ تجویز کی گئی کہ ملزم کو ان کے رکھنے اور پرورش کرنے میں تامل ہوگا۔ اسلئے دونوں یتیم خانہ میں بھیجدیئے جائیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ اس سے زیادہ اور کیا انصاف ہو سکتا ہے اس پر بھی اگر ممتحن صاحب مجھ کو فیل کر دیں تو اسکو ظلم نہ کہیں تو اور کیا کہینگے، انصاف آپ ناظرین کے ہاتھ میں ہے، میں نے یہ جوابات والد صاحب کو بھی سنائے انہوں نے بہت تعریف کی ممتحنوں کو بہت برا بھلا کہا۔ میری بہت تشفی کی۔ اور فرمایا بیٹا کوئی گھبرانیکی بات نہیں اس سال نہیں آئندہ سال سہی۔ آخر کہاں تک بے ایمانی ہوگی۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ خیر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

جو کچھ ہوا سو ہوا ایک سال کی فرصت تو مل گئی۔

تصویر کا دوسرا رخ

بلا بلفظ عرب امتحان بود یعنی   کہ بندہ را بہ بلا امتحان کند۔ اور

بخدا امتحان بڑی سخت چیز ہے، خدا کسی کو امتحان میں نہ ڈالے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ جب امتحان کا خیال آجاتا ہے تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو مصیبتیں امتحان کے زمانہ میں مجھ پر گزریں وہ سب نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ میرا دل اپنے امتحان کے واقعات لکھتے ہوئے کانپتا ہے مگر چند محبوں اور محسنوں کا اصرار ہے اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

کسی زمانہ میں ہم لوگ بھی بڑے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن زمانہ کی گردش نے رفتہ رفتہ اچھی طرح پیس دیا۔ اور ایک وہ زمانہ آگیا کہ ہمارے رشتہ دار بھی تعلق ظاہر کرنے سے اجتناب کرنے لگے۔

والد صاحب قبلہ مرحوم کے زمانۂ حیات تک کسی نہ کسی طرح گزرے جاتی تھی، لیکن مرحوم کی فراخ دستی اور اثاثہ کی کمی نے افلاس کی آخری حد تک ہم کو پہنچا دیا تھا۔ اُن کے انتقال کے وقت میری عمر کوئی سترہ سال کی تھی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ لا کلاس کا پہلا سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ یکایک انفلوئنزا میں ان کا انتقال ہو گیا، تمام گھر بیمار پڑا بیماری کے اخراجات نے رہا سہا اور بھی ٹھکانے لگا دیا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ جب سب بیماری سے اٹھے تو رہنے کا مکان بھی فروخت کرنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا مکان (عہ) کرایہ سے لیکر جا رہے۔ گھر میں میری والدہ صاحبہ تھیں میں اور میری چھوٹی بہن صفیہ۔ اسکی عمر پانچ سال کی تھی۔ والدہ کے پاس سلائی کا کچھ کپڑا آجاتا اُس سے اور تھوڑا بہت جو زیور رہا تھا، اسکو بیچ بیچ کر گزارہ کرتے۔ جب آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہیں ہوتا۔ تھوڑے دنوں میں جو کچھ رہا سہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں میری لا کلاس کی مدت بھی ختم ہو گئی، اور امتحان کا زمانہ بھی قریب آگیا اب سب سے بڑی مشکل فیس کی تھی کوئی ایسی چیز پاس نہ تھی کہ گروی رکھکر یا بیچ کر یہ رقم ادا کیجاتی، کوئی ایسا ہمت والا رشتہ دار نہ تھا کہ صرف ایک دستہ پر پچاس ساٹھ روپے کی

رقم نہ تھا، رضیہ کے پاس گلے کا ایک کچھا اور پاؤں میں پازیب رہ گئی تھی۔ والدہ صاحبہ نے کہا کہ اسکو فروخت کر کے کام چلاؤ اگر خدا نے کیا تو شاید اسی امتحان کے بعد ہمارے دن پھریں۔ میری حمیت گوارہ نہ کرتی تھی کہ اس معصوم کا زیور لوں، لیکن کیا کیا جاتا۔ اور کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ والدہ صاحبہ جب رضیہ کا زیور اُتارنے لگیں تو وہ مچل گئی، انہوں نے سمجھانا شروع کیا کہ دیکھو بھائی جان پاس ہو جائیں گے تو تم کو اتنا زیور بنا دیں گے۔ تمہارے لئے گڑیاں لائیں گے تمکو اچھے اچھے کپڑے سلوا دیں گے۔ میں یہہ سب سنتا رہا۔ لیکن رضیہ کے ایک فقرہ نے ایسا بیتاب کر دیا کہ مجھ سے وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ اُسکا یہہ کہنا کہ "اگر بھائی صاحب پاس نہ ہوئے تو" میرے دل میں تیر کی طرح لگا۔ گو اماں سمجھاتی رہیں کہ نہیں بیٹا ایسی فال زبان سے نہیں نکالا کرتے، وہ انشا اللہ ضرور پاس ہونگے، لیکن رضیہ کے الفاظ ایک تیر تھے کہ اپنا کام کر گئے، بہرحال والدہ صاحبہ نے چنی لال مارواڑی کے پاس ساٹھ روپیہ میں دونوں چیزیں گروی کر دیں۔ مجھے دس روپیے دیئے کہ جاؤ فیس داخل کراؤ۔ اور نو روپیے گھر کے خرچ کے لئے رکھ لئے، قصہ مختصر میں نے فیس داخل کر دی، رات دن محنت کرتا، لیکن ہر وقت یہہ فکر رہتی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جب خیال آتا تو بُرا ہی خیال آتا، بیمار بھی پڑا۔ مگر دو چار روز میں اچھا ہو گیا۔ آخر امتحان کا دن آ ہی گیا، اماں نے کہیں نہ کہیں سے کر کے دودھ نان پاؤ رات کو رکھ دیا تھا کہ صبح ہی صبح کھا کر چلا جاؤں گا لیکن بدقسمتی سے بلی دودھ پی گئی، صبح کو جو والدہ صاحبہ اٹھیں سر پکڑ کر رہ گئیں۔ گھر میں ایک پیسہ نہ تھا۔ میں بھی اٹھا۔ اُنھوں نے مجھ سے ذکر کیا میں نے کہا اماں آپ ناحق فکر کرتی ہیں، مجھے آج بھوک نہیں ہے، میں یہہ کہکر چلا گیا۔ امتحان کے کمرہ میں اپنی جگہ تلاش کر لی، اور بیٹھ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں بھوک کی وجہ سے چکر آنے لگے، اتنے میں پرچہ تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ مجھے بھی ملا۔ میں نے دیکھا۔ لیکن ایک حرف سمجھ میں نہیں آیا۔ ساتھ ہی سر میں چکر آیا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں نے میز پر سر رکھدیا۔ اس غفلت میں یہ نظر آیا کہ والدہ صاحبہ رضیہ کے زیور اُتار رہی ہیں۔ وہ مچل رہی ہے۔ یہ اسکو سمجھا رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹا تیرے بھائی پاس ہو جائینگے

تجھ کو یہ لاکر دینگے۔ وہ لاکر دینگے۔ رضیہ نے میری طرف غور سے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "اور جو یہ پاس نہیں ہوئے تو" میرا سلسلۂ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے آواز دی کہ "جناب یہ امتحان کا کمرہ ہے سونے کی جگہ نہیں ہے" میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک صاحب گشت کرتے ہوئے میری طرف آئے اور کہا کہ "آپ امتحان دینے آئے ہیں یا سونے آئے ہیں" میں کھڑا ہو کر کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ میرے پاؤں لڑکھڑانے لگے، انہوں نے دوڑ کر مجھے سنبھالا۔ اور چپراسی کو آواز دی کہ پانی لاؤ۔ پانی آیا تو مجھے پلایا۔ اس وقت میرے حواس کچھ درست ہوئے پرچہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ رضیہ کا فقرہ یاد آیا۔ "اور جو یہ پاس نہ ہوئے تو" اس کا یاد آنا تھا کہ گذشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور ساتھ ہی کمرہ بالکل تاریک معلوم ہونے لگا، نگران کار صاحب یہ کیفیت برابر ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ کچھ سوچ کر میری طرف بڑھے اور کہا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہوشیار بھی ہیں اور ذہین بھی۔ اور محنت بھی کی ہے لیکن آپ کی اس حالت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ بیمار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آج آپ بھوکے تو نہیں ہیں۔ یہ لفظ سننے تھے کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں چپکا ہو گیا انہوں نے پھر وہی سوال کیا۔ میں نے کہا جی ہاں میں آج کھانا کھا کر نہیں آیا انہوں نے کہا کیوں پہلے تو میں خاموش رہا جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے بہت نیچی آواز میں کہا کہ "گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار انکے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے "کیا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا" میں نے کہا جی ہاں کچھ نہ تھا۔ میں نے انکی طرف نظر اٹھائی تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ پر ایک قسم کی سرخی دوڑ گئی تھی، انہوں نے اسی وقت چپراسی کو آواز دی کہ نیچے ہوٹل سے جا کر ایک پیالی چائے تھوڑے سے بسکٹ اور دو تین سموسے لے آؤ۔ یہ کہکر وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گئے اور اُن سے کچھ کہکر میری طرف آئے اور کہا آپ میرے ساتھ آئیے۔ پرچہ کا خیال کیجئے پہلے کچھ ناشتہ کر لیجئے، بعد میں پرچہ بھی ہو جائیگا میں نے انکار کیا وہ زبردستی مجھکو سپرنٹنڈنٹ صاحب

میز کے پاس لے گئے، وہاں قریب ہی ایک چھوٹی میز پر چائے وغیرہ رکھی ہوئی تھی، مجھ سے کہا آپ اچھی طرح ناشتہ کر لیجئے۔ خالی پیٹ سے پرچہ کیا خاک سمجھ میں آئیگا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چائے پینے لگا۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں تمام حالات پوچھ لئے اور کہنے لگے تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ سلائی کے آج کچھ پیسے آنیوالے ہیں، خدا دن گذار دیگا۔ انہوں نے کہا اور اگر آج پیسے نہ آئے تو؟ میں نے کہا ایسی حالتیں ہم غریبوں پر اکثر گذرتی ہیں بہرحال چائے کی پیالی پی کر میرے اوسان درست ہوئے۔ انہوں نے اصرار کرکے دو چار بسکٹ بھی کھلائے اور کہا اب آپ اپنی جگہ پر بیٹھئے مگر گھبرائیے نہیں پرچہ آسان ہے۔ پرچہ سے غرض رکھئے۔ گذشتہ اور آئندہ واقعات کو دل میں نہ لائیے انشاءاللہ آپ کامیاب ہونگے اور ضرور کامیاب ہونگے پرچے کے بعد دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ میں یہ بھی دیکھ لونگا کہ آپنے پرچہ کیسا لکھا۔ میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھا۔ پرچہ دیکھا تو واقعی آسان تھا میرے محسن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میرے پاس آتے اور کہتے آپ گھبرائیے نہیں خدا مسبب الاسباب ہے کوئی نہ کوئی صورت آپکی بہتری کی نکال دیگا، ایک بجے مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ساتھ میں نے اور انہوں نے بیٹھکر کھانا کھایا، انہوں نے پوچھا کہ کون صاحب ہیں، انہوں نے کہا کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کا لڑکا ہے میں کچھ بولنا چاہتا تھا۔ مگر اُن کے تیور دیکھکر خاموش ہوگیا۔ بہرحال میں نے دوسرا پرچہ بھی بہت اچھا کر دیا اور نگران کار صاحب سے ملکر اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ والدہ صاحبہ جانماز پر بیٹھی ہیں، رضیہ انکے پاس بیٹھی ہے۔ وہ دعائیں مانگ رہی ہیں اور رضیہ آمین کہہ رہی ہے پہلے تو انہوں نے میری نیک راستی اور کامیابی کی دعا مانگی۔ اسکے بعد جو دعا مانگی اُس سے مجھے حیرت ہوگئی۔ فرمانے لگیں یا الٰہ العالمین جس نے اس مصیبت میں ہماری خبرگیری کی ہے تو ہر مصیبت سے اسکو بچائیو۔ رضیہ نے کہا آمین۔ یا میرے پروردگار جس نے میرے بچوں کا دُکھ درد سمجھا تو اسکو ہر دکھ درد سے محفوظ رکھیو۔ یا باری تعالیٰ جس نے ہم دکھیاروں کی

اس بیکسی میں مدد کی تو ہر حال میں اُسکی مدد کیجیو یا الہ العالمین اپنے حبیب پاک کے صدقہ سے اسکو ہر آفت سے بچا۔ اُسکی بیوی اور بچوں کو خوش خرم رکھیو اور جس طرح اُس نے ہم غریبوں کے ساتھ سلوک کیا اُسکے ساتھ سلوک کر، رضیہ برابر آمین کہتی جاتی تھی۔ جب والدہ صاحبہ دعا سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے میٹھ پھیری مجھے کھڑا پایا فرمانے لگیں۔ کہو بیٹا پرچے کیسے کرکے آئے میں نے کہا بہت اچھے لیکن اگر ایک صاحب میری وقت پر مدد نہ کرتے تو خدا جانے کیسی گذرتی انہوں نے واقعات پوچھے۔ میں نے بے کم و کاست بیان کردیئے۔ وہ یہہ سنتے ہی سجدہ میں گر پڑیں اور بڑی دیر تک رو رو کر چپکے ہی چپکے دعائیں مانگتی رہیں، سجدہ سے سر اٹھا کر انہوں نے جانماز کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہنے لگیں ہو نہو یہ بھی کوئی فرشتہ رحمت ہے، میں نے خط دیکھا لکھا تھا "جناب ہمشیرہ صاحبہ تسلیم افسوس ہے آج کل ہم لوگ ہماہمی میں کچھ ایسے گرفتار ہو گئے ہیں کہ اپنے غریب اور شریف بھائی بہنوں کی خبر رکھنا اور لینا بے ضرورت سمجھتے ہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ لوگوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد اگر اپنے مقدور کے موافق میں آپکی امداد نہ کروں تو باری تعالیٰ کو کیا جواب دے سکونگا یہہ معلوم کرنے کے بعد رضیہ سلمہا کے زیور کس طرح اور کیوں گروی پڑے ہیں اگر میرے بال بچے زیور پہنیں تو کس منہ سے میں اس غریب نواز حضرت رسالتمآب کے سامنے جاؤنگا جو کچھ اس وقت مجھ سے ہو سکا وہ گذرانتا ہوں۔ قرض حسنہ سمجھ کر قبول فرمائیے۔ ماشاءاللہ آپکا بچہ بڑا ہوشیار ہے، وہ ادا کردیگا اور اگر نہ ادا کیا تو میں اُسے معاف کرتا ہوں لیکن آپ خدا کے لئے رضیہ کا دل نہ توڑیئے۔ اُسکا زیور منگوا دیجئے۔ کیونکہ جبتک میں نہ سُن لونگا اُس کا زیور اسکو مل گیا۔ مجھے چین نہ آئیگا۔ دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھکو اپنے غریب بھائی بہنوں کی مدد کی توفیق عنایت فرمائے"

خط کے ساتھ سو روپیہ کے نوٹ تھے۔ اماں فرمانے لگیں کہ آج تین بجے کے قریب ایک چپراسی آیا تھا۔ یہ دیکر اور یہہ کہکر چلا گیا کہ بیگم صاحبہ کا خط ہے، ابھی کھول کر اسکو پڑھ لیں مضمون سے تو سمجھہ میں آتا تھا کہ میرے نام کا ہے۔ لیکن یہ سمجھہ میں کسی طرح نہیں آتا تھا کہ یہ کون اللہ کا

نیک بند ہے۔ چلو تمہارے بتانے سے یہ بھی معلوم ہوگیا۔ میں نے کہا اماں اسطرح روپیہ لینا ٹھیک نہیں، بہتر ہوگا کہ کل میں لیجاکر واپس کردوں، والدہ صاحبہ نے کہا کہ نہیں بیٹا۔ ہرگز نہیں اسطرح روپیہ واپس کرنے سے انکی توہین ہوگی تم انکا شکریہ ادا کردو اور کہدو کہ "بھائی یہ تمہارا قرضہ ہے، خدا تمہیں اسکی جزائے خیر دے، تم نے ہم بے وارثوں کا وقت پر ہاتھ پکڑا۔ ہم اور ہماری اولاد ہمیشہ تمہارے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہونگے۔ اور ان سے یہ بھی کہدینا کہ بھائی ہم کیا اور ہماری دعا کیا۔ لیکن اس دکھیا کے دل سے مرتے دم تک جو دعا نکلیگی وہ تمہارے اور تمہارے بال بچوں ہی کے لئے نکلیگی۔ میں خاموش ہوگیا۔ پھر فرمانے لگیں بیٹا جا چُنی لال کو روپیہ دیکر رضیہ کا زیور لے آ، اس معصوم کے دل سے خوش ہوکر دعا نکلیگی تو انشاءاللہ ہمارے محسن کا دین و دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ میں چُنی لال سے دونوں چیزیں چھڑا کر لایا۔ والدہ صاحبہ نے رضیہ کو پہنایا۔ وہ ایسی خوش ہوئی کہ کیا بیان کروں کہنے لگی "کیا بھائی جان پاس ہوگئے" اماں نے کہا، انشاءاللہ اب پاس ہوجائیں گے، بیٹا تم دعا مانگو کہ جس نے تمہیں یہ چیزیں واپس دلوائیں خدا اسکو دونوں جہان میں جزائے خیر دے۔ غرض اماں کہتی جاتی تھیں اور رضیہ دعا مانگتی جاتی تھی اس عرصہ میں مغرب کا وقت ہوگیا۔ نماز پڑھنے کے بعد جب میں نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو دن کے تمام واقعات یاد آگئے۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ زبان یاری نہ دیتی تھی اماں نے جو میری یہ حالت دیکھی فرمانے لگیں "ہاں بیٹا یہی دعا کا وقت ہے۔ اپنے اور میرے لئے کچھ نہیں اپنے محسن کے لئے دعا کر خدا قبول کریگا" بہرحال نماز سے فارغ ہوکر میں کتاب دیکھنے لگا اور کوئی بارہ بجے سو گیا۔ صبح اٹھکر پھر امتحان میں گیا۔ دروازہ ہی پر نگرانکار صاحب ملے۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے مجھے روک دیا اور کہا میاں صاحبزادے اب میں تمہارا مہاجن ہوں، تمکو جب ضرورت ہو مجھ سے بے تکلف لیجانا۔ مگر یاد رکھنا کہ تم سے یہ رقم مارواڑیوں سے زیادہ سختی سے وصول کرونگا"

کھانے کے وقت پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لیگئے اور ساتھ ہی کھانا کھلایا میں نے جو کچھ الٹا سیدھا

کہا تھا ان سے عرض کیا کہنے لگے "میاں ماں کی قدر کرو جو مصیبتیں اٹھا اٹھا کر تم کو پال رہی ہے لیا تم کرنا کہ آئندہ یہ تمام واقعات بھول جاؤ اور بیوی کے سامنے ان کو کونے میں بٹھا دو" غرض اسی طرح وہ مجھے نصیحتیں کرتے رہے آج کے پرچے بھی میں نے بہت اچھے کئے اور خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا اب نتیجے کے انتظار میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ ہفتے کے دن نتیجہ شائع ہوگا۔ میں بھی بحالت امید و بیم پہنچا دیکھا کہ نوٹس بورڈ پر نتیجہ لگا ہوا ہے اور سامنے سیکڑوں امیدوار کھڑے دیکھ رہے ہیں میں بھی گھس گیا اور نتیجہ دیکھنا شروع کیا لیکن میرے نام کا نمبر نہیں۔ کئی دفعہ دیکھا لیکن نام کا پتہ نہ چلا۔ آخر مایوسی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اتنے میں کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا پھر کر دیکھوں تو وہی میرا فرشتہ رحمت۔ ہنس کر کہنے لگے "کہو پاس ہو گئے" میں نے کہا "نہیں" انہوں نے نوٹس بورڈ جا کر دیکھا اور پھر میرے پاس آ کر کہنے لگے "ارے میاں تمہارا نام تو سب سے اول تھا۔ کسی دل جلے نے اوپر کا حصہ پھاڑ دیا ہے" مجھے یقین نہ آیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر رجسٹرار صاحب کے پاس لے گئے اور اصل رجسٹر میرے سامنے رکھ کر کہا کہ لو دیکھ لو اور اطمینان کر لو۔ مگر میاں ہم مٹھائی ضرور کھائیں گے یہ نہ ہو کہ پاس ہونے کے بعد ہم کو ٹال دو رجسٹرار صاحب نے بھی مبارکباد دی اور میرے پرچوں کی بہت تعریف کرتے رہے۔ خیر میں خوشی خوشی گھر پہنچا والدہ صاحبہ سے جا کر کہا، وہ بڑی دیر تک مجھے گلے سے لگا کر روتی رہیں کہ اتنے میں کسی نے آ کر کہا کہ ایک زنانہ گاڑی دروازہ پر کھڑی ہے باہر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر محسن کی بیوی میری والدہ کو مبارکباد دینے آئی ہیں۔ خیر انکو اتروا کر میں تو باہر چلا گیا وہ ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا وہ تشریف لے گئیں اور میری والدہ سے کہہ گئیں کہ کل آپ کی اور آپکے صاحبزادے اور صاحبزادی کی میرے یہاں دعوت ہے گاڑی آئے گی آپ ضرور آئیے۔ دوسرے روز سہ پہر کو گاڑی آئی اور ہم لوگ سوار ہو کر وہاں پہنچے جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ بیسیوں گاڑیاں اور موٹریں دروازہ پر کھڑی ہیں اور ایک بڑے ایٹ ہوم کا انتظام ہے۔ شہر کے اکثر عہدہ دار اور بڑے بڑے وکیل جمع ہیں میر محسن نے میرا تعارف سب سے کرایا، ہر ایک سے یہی کہتے تھے کہ میرے ایک مرحوم عزیز دوست کا لڑکا ہے تھوڑی دیر باتیں ہونے کے بعد سب لوگ میز پر گئے اور ہنسی خوشی وقت گزر گیا کھانا ختم ہونے کے بعد میر محسن نے کہا "دوستو! ایٹ ہوم میں کسی اسپیچ دینے کا دستور نہیں ہے۔ لیکن خاص حالات کی وجہ سے

میں اس طریقے کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں دعوت کے کارڈ گو میری طرف سے تقسیم ہوئے ہیں لیکن اصل داعی اس دعوت کے (میری طرف اشارہ کر کے) یہ ہیں۔ انہوں نے صرف اس خیال سے کہ آپ صاحبوں سے ان کی پہلی ملاقات نہ تھی، یہ ذمہ داری میرے سر رکھی اور میں نے اس خیال سے اس کو قبول کیا کہ اس طرح آپ لوگوں سے میں ان کا تعارف کرا سکوں گا۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ اس سال کے امتحان وکالت میں یہ سب سے اول رہے ہیں اور اس بات کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہایت شریف محنتی ایماندار اور سمجھدار شخص ہیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ ابتدائے وکالت میں اگر میرے عزیز دوستوں میں سے کسی نے ان کو اپنے ساتھ لے لیا اور آپ صاحبوں نے ان کی بہبودی اور جائز رعایت کا خیال پیش نظر رکھا تو یہ ایک ہوشیار اور کامیاب وکیل ثابت ہوں گے۔ کیا میرے عزیز دوستوں میں سے کوئی میری اس استدعا کو قبول فرمائیں گے؟" اس اسپیچ کے ختم ہوتے ہی شہر کے سب سے ممتاز وکیل یعنی مولوی اصغر خاں صاحب اٹھے اور کہا "میرے عزیز فیاض دوست نے اس نوجوان دوست کے تمام واقعات مجھ سے بیان کر دیے ہیں۔ میں اپنے اس نوجوان دوست کی مدد کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں اور نہایت خوشی سے اپنے ساتھ وکالت میں شریک کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں ان سے یہ ضرور خواہش کروں گا کہ یہ اپنے تمام واقعات بے کم و کاست چھپوا دیں تا کہ ہم لوگوں کو جو روپے کو بے دریغ لٹا رہے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اکثر بھائی اور نہیں کس مصیبت میں ہیں اور کس طرح غربت بسا اوقات ہمارے جواہر پاروں کو خاک میں ملا دیتی ہے، اور کس طرح ہم لوگ اپنی ہمدردی کے فرض کو بھول کر روپے کو بے محل عیش و واہیات اور خرافات میں تباہ کر رہے ہیں۔" اس کے بعد میں نے متاثر ہو کر بہت مختصر الفاظ میں وکیل صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے واقعات کے طبع کرانے کا وعدہ کیا۔ اپنے محسن کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میرا گلا بند ہو گیا اور میں ایک حرف نہ بول سکا۔ یہ دیکھ کر وہ خود اٹھے مجھے گلے سے لگایا اور کہا میاں صاحبزادہ میری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کبھی اپنے کسی بھائی کی بروقت مدد کی تو میں سمجھ لوں گا کہ احسان کا بدلہ احسان سے ہو گیا، جاؤ اب محنت کرو عدالت کا ادب کرو اپنے ہم پیشہ بھائیوں سے مل جل کر کام کرو، اپنے موکلین کی دلجوئی کرو سچ پر قائم رہو خدا تم کو کامیاب کریگا۔ اس دعوت میں جو وعدہ میں نے کیا تھا اس کی تعمیل میں میں نے یہ اپنے حالات لکھے ہیں خدا کرے ان کے پڑھنے سے دو ایک سبق حاصل کریں اور ہم لوگوں میں وہ اسپرٹ پیدا ہو جائے جو میرے محسن میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے

خدا کا شکر ہے کہ میری وکالت بہت اچھی چل رہی ہے۔ مگر آپ کو باور کراتا ہوں کہ جب امتحان کا خیال آتا ہے تو میرا دل لرز جاتا ہے۔

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(۱) تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن ؛ تا بماند نامِ نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم انسان "ایک محشر خیال" ہے لیکن خیال میں حشر برپا ہونے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو انکے حالات کو ایک جگہ جمع کرنیکا خیال پیدا کرتی، اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوشنما [illegible]

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر کے ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف انکی چلتی پھرتی تصویریں دکھاؤں۔ خیال میں دفعتہً پختگی ہوئی۔ اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرہ کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے ؛ بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا دل میں آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اُردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعہ کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا، برخلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی، پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کیلئے نظر فریب رہی اور اس "اجڑے دربار" میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنا دشوار ہے زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن سے بہت تو ملک عدم کو سدھارے جو بچے کچھے رہ گئے تھے انکو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ جسکو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا، دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر انکو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت اٹھ گئے بہت سے اٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنیوالا ہے کہ کوئی یہ بتلانے والا بھی نہ رہیگا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا جسطرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان چراغ ہائے سحری کو دیکھ دیکھکر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اردو" کے لئے ان ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جسکی روشنی میں آنیوالی نسلیں زبان اُردو کے محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں۔ اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے، جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اسکی شکل و صورت حرکات و سکنات آواز کی کیفیت نشست و برخاست کے طریقے طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ

اُس کے لباس اور وضع کا خیال دل میں رہے تو اُس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے، اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اسکی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں ان کے حالات درج نہ کئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا اور اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں، بہت سے ایسے مرقع پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں، بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہونگی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں لیکن ہر صورت میں شہادت تائید کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنے اگر کسی واقعہ کے متعلق ایک بھی مخالف بات ہوئی تو اس واقعہ کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بنکر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا۔ ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب سنہ ۱۲۶۱ ہجری کے ایک مشاعرہ کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں۔ البتہ اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ سنہ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا

گویا یہ سب میرے چشم دیدہ ہیں۔ اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام — ہفتصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانہ کا بھی "مرزا صاحب" بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اپنے مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اسکو اتنی وسعت دی ہے کہ اُس وقت کے تقریباً سب بڑے بڑے شعراء کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی، مگر نباہ نہ سکے، جو اُن سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں، ممکن ہے کہ کسی طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگانِ خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجئے "میں" اب مولوی کریم الدین صاحب کی جوتی میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہئے مولوی صاحب کو کہئے اور خوب دل بھر کر کہئے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام

مرزا فرحت اللہ بیگ

۲۔ تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ✽ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دہلی سے ۳۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا لیکن زمانہ کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائداد ضبط ہو گئی میرے دادا صاحب تنگ آ کر ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں سنہ ۱۲۳۶ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا میری تعلیم انہی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بے چین طبیعت اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑوایا اس زمانہ میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ ملا کی دوڑ مسجد میں بھی پانی پت چھوڑ دہلی میں آ گیا۔ شہر میں چھاپے خانے نئے نئے چلے تھے کاپی نویسی سے گزارا کرتا۔ محنت مزدوری کے بعد بھی ذوقِ علم ہر حلقہ درس میں کھینچے جاتا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی، طالب علموں کی تلاش تھی میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپے وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لئے حاصل کیا جاتا اب اس کے ساتھ گزارہ کی بڑی شرط لگ گئی تھی

اس لئے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النسا بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہئے تھا نہ چلا۔ یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے خیال آیا کہ ایک مشاعرہ کرکے شعرا کے حالات اور ان کا کلام طبع کروں۔ ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے، بلکہ شعر کہنا میں بُرا جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے، وہ لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنے دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں۔

میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کے فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا، مگر کیا کروں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی۔ غریب کو منہ نہیں لگاتے۔ دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملہ میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں، عارف پر نظر پڑی ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اُسکو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں، البتہ داڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے۔ ٹھڈی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی کچھ عرصہ تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے، بہرحال ان کی محبت اُنکی شرافت اور سب سے زیادہ اُن کے رسوخ نے مجھے اُنکی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں اُنکی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل اُن کے

مکان پر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں ہی میں تھا۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعے اطلاع کرائی۔ انہوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا چبوترہ ہے، اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے، ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے، سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے، میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی کہنے لگے مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے، بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا علاج کر رہا ہوں مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے؟" میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر ایک آہ بھر کر کہا "میاں کریم الدین، گو بات تو اچھی سوچی ہے۔ مگر بھئی پکا نباہنا مشکل ہے، تمہیں خبر نہیں دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دیئے ہیں دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری تمنا پوری ہو جائے گی اور تمہارا بھی کام نکل جائے گا۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب نکل آئے، گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی داڑھی گول چہرہ، کہیں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، سر سے پاؤں تک سفید

لباس پہنے ہوئے تھے۔ فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں میں آداب بجالایا
میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب صاحب سے کہا "آپ کی تعریف کیجیے" انہوں
نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں" خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آجکل
خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں ان کے حلیے اور
ان کے کلام کے نمونے دکھائیں، مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے
ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب اپنا آخری وقت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پرانے رنگ کا
مشاعرہ اور دیکھ لوں۔ اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے" حکیم صاحب
کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لئے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو ابھی جوان ہو
انشاءاللہ خود طبیعت مرض پر غالب آجائیگی، اور تمہیں مرض ہی کیا ہے وہم ہی وہم
ہے" مگر ہاں یہ تو بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو" نواب صاحب نے کہا
حکیم جی اور کچھ نہیں اتنا کردو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔
میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی، میں انکو سب کچھ سمجھا دونگا۔ اگر حضرت ظل اللہ
اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں، اگر بدقسمتی
سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرہ کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرہ کا انتظام
وہ میں خود کروں گا۔ کیوں کہ یہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں" حکیم صاحب
پہلے تو کچھ سوچتے رہے پھر کہا، عارف! تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار
ہوں، اس لئے اور بھی کر دوں گا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائیگی اور کچھ دنوں
اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے بادشاہ
سلامت سے تو میں کہتا نہیں۔ ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا...
فتح الملک بہادر سے ملا دیتا ہوں" انکو آجکل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے حضور سے

؏ ان کا نام مرزا فخرالدین، خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا

بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں، مگر وہ ٹال گئے۔ اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلیٰ میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہہ جاتا ہوں یہ اندر پہنچا دیگا، آگے آپ جائیں آپ کی قسمت۔" یہ کہکر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی نمبر ۱ میں ایک بجے آئیں گے ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا۔" یہ کہکر نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ قلعہ معلیٰ پہنچا لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے وہ مجھکو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے بیٹھک جس کو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے مجھے دیکھکر بولے "اجی! مولوی صاحب میں نے آپکا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لئے لیتا ہوں۔ مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہئے کہ ہم لوگ بھی آسکیں خیر بیٹھئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے

بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ر جولائی سنہ ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا ان کے انتقال کے بعد مرزا جوان بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے پڑے

ے قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمن خاں احسان کا شعر ہے

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں ﴿ بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

ہوجائیگا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہوگی۔ اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہ سمایا ہوگا۔" حکم حاکم مرگ مفاجات اُٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیتہ الکرسی پڑھتا رہا۔ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لئے جا رہا ہے اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے اندر آگئے آخر خدا خدا کرکے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے پاس لیجا کھڑا کر دیا۔ اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے اس کے دو درجے ہیں ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈالکر خسخانہ بنا لیا جاتا ہے اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوارے چلتے ہیں حمام کیا ہے ایک بہشت کا نمونہ ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہوگیا پسینہ میں تر بتر گردن نیچی کئے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینہ کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی چوبدار نے آکر کہا کہ "چلئے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی خیر کسی نہ کسی طرح اٹھے سیدھے پاؤں پڑتا حمام مبارک میں داخل ہوگیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب" "نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت آداب بجا لاؤ" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھکر آیا تھا۔ دوہرا ہوکر سات تسلیمات بجا لایا۔ اور نذر گزرانی، نذر دیتے وقت فرمایا

تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی، لمبی گردن۔ جو کا ذرا اونچا۔ پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ گہری سانولی رنگت۔ سر منڈا ہوا۔ چھدری ڈاڑھی۔ کلوں پر بہت کم تھوڑی پر ذرا زیادہ لیں کتری ہوئی۔ ۷۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھگ ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی داڑھی میں اکا دکا سیاہ بال تھا۔ چہرہ پر جھریاں تھیں لیکن باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتا زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین میں باپ کی تصویر تھے: ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے، یہ جوان ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا۔ ان کی ڈاڑھی سفید تھی۔ انکی سیاہ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں، دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا: "اماں[1] - تمہارا ہی نام کریم الدین ہے تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو" میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے،

---

[1] قلعہ دہلی کے دور آخر میں شاہان دہلی بعض وقت مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے اس پرانے طرز کلام کی جھلک حیدرآباد کی روزمرہ میں بھی کیتقدر نظر آتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقہ تخاطب کی بناء پر قلعہ معلی کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ انکو یہ پڑھکر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں انکے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں"، ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ "اے میاں"، کا اختصار ہے جنابخاب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہے جاتے ہیں۔ (اڈیٹر)

بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے، میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں زمانہ کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھ سکے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسے میں مشاعرہ شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کچھ غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے، استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں مگر خدا بچائے حافظ ویراں سے وہ ضرور لڑ مریں گے۔ اور تم جانتے ہو۔ اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا" کی صورت ہے۔ کسی نے اگر مشاعرہ میں استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم میری کیا ہستی ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرہ کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمہ لیا ہے۔" فرمایا "تو مجھے اطمینان ہے یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں وہ سنبھال لیگا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دونگا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں، ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا اور ان شاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے" "طرح" ہی تو بڑے

جھگڑے کی چیز ہے، یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی "ارے ہے یہ انا بچہ کو کیا بے طرح سُلا گئی ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرہ میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔" نہ لینا ایک نہ دینا دو۔" میں نے عرض کی پیر و مرشد تاریخ۔ فرمایا ۱۴ رجب مقرر کر دو دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی۔ آج پانچ ہے نو دن باقی ہیں۔ اتنے دنوں میں بہت انتظام ہو سکتا۔ انگریزی کی ۲۰ جولائی پڑے گی موسم بھی ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اچھا اب خدا حافظ میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی۔ اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے "بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے" یہاں میں اتنا ضرور کہونگا کہ میرے لئے حضوری اتنی مشکل نہ تھی جتنا رخصت ہو کر الٹے پاؤں چلنا ہوا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی ابھی دو چار قدم ہی چلا ہونگا کہ پیچھے ایک دیوار سے ٹکرایا۔ اس ٹکر سے ذرا سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا خیر بہزار مشکل اس جادۂ ادب کو طے کرکے باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا ادھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے "مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کیلئے بیچین ہو رہے تھے ان ہی کی یہ کارگزاری ہے۔ ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا، میاں عارف سے بھی جا کر کہدو۔ وہ میرے ہی ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہونگے"

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں

بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کئے کہنے لگے چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی اب تم یہہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو، مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا جب دیکھو کہ ان میں کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا کیا عجب ہے کہ میرا نام سنکر راضی ہوجائیں۔ دوسری بات یہہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کرو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے عرض کی اور میں کہاں جاؤں۔" فرمانے لگے میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لئے آجاؤ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو انھیں کے رتبہ کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا، دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سوا سو روپے اٹھ جائیں گے یہ سنکر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہوجاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر پوچھو پورا ہوگیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سنکر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے میں نے کہا نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہہ مشکل بھی آسان کردیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کردینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو ذرا آرام لے لو اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو۔ ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ

مکان خالی ہو جائے تو فوراً ہی مجھے اطلاع دینا - اور خود میرے ہاں چلے آنا اس میں شرم کی کونسی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا - مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی صبح اٹھ کر اپنے پہننے، اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ پہلے اُستاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں -

کابلی دروازہ کے پاس ہی ان کا مکان ہے - بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے - اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے - اندر صحن اتنا چھوٹا کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لئے مشکل سے جگہ رہتی ہے - سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ - صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے - جب میں پہنچا تو تو استاد صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے - دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویراں بیٹھے تھے - یہ اندھے ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں نے ارشاد فرمایا تھا - اُستاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں - رنگ اچھا سانولا ہے، چہرہ پر چیچک کے بہت داغ ہیں - آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں - چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے اس وقت سفید تنگ پائجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی تھی - میرا صحن میں قدم رکھنا تھا کہ پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویراں نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا "کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" اُستاد نے اپنا نام سنکر کہا "آیئے آیئے اندر تشریف لایئے" میں نے آداب کیا، انہوں نے فرمایا "بیٹھو بھئی بیٹھو" میں حافظ ویراں کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا - کہا "فرمایئے کیسے تشریف لانا ہوا - میں نے عرض کیا کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع

کرنیکا ہے ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی ازراہِ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جائیے جائیے۔ کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا سے بالک کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔" استاد نے کہا "بھئی ویران۔ تمہاری زبان نہیں کٹتی بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔" حافظ ویران کہنے لگے۔ "استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھے لگے وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں کل ہی کی بات ہے کہ آپ کو ناوڑا کو رہے تھے مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے اُن کی سات پشت کو توم ڈالا۔" استاد ہنسکر فرمانے لگے "بھئی نا۔ تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے کہے میں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دیدیا ہے۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور جو خود ہی تو برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں برا کہنے سے اسکے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ میں کل بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرہ میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیجکر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی

ؔ ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے انکو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسطرف اشارہ کیا ہے ہوا محفوظ رکھے دلی والوں سے جو باہر سے آیا اُسکے حسب نسب میں انہوں نے کیڑے ڈالے۔ اُستاد ذوق کو شہر بھر نانی کہتا ہے یہ اور دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں اشعر کی بجائے تلوار دیکر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے

بھی کہدینگے وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئینگے۔ یہ سنکر حافظ ویراں تو ٹھنڈے پڑ گئے استاد نے فرمایا ہاں بھئی مجھے یاد آگیا کل شام کو حضرت پیرو مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو۔ میاں میں انشاء اللہ تعالے ضرور آؤنگا۔ مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے؟ میں نے عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکالدیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیہ میں چاہے اگر غزل پڑھے۔ استاد تو بہت خوب بہت خوب" کہتے رہے مگر حافظ ویراں کی تیوری کے بل نہیں گئے برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ اللہ خیر کرے دیکھئے اس مشاعرہ کا کیا حشر ہوتا ہے، حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے، شگوفے[1] چھوڑا کرتے ہیں، وہ اپنی کہے گئے۔ میں تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملا اسد اللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان کی گلی گئی ہے، بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ، محل سرا کا ایک راستہ مردانہ مکان میں سے بھی ہے باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھڑیاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گذر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکئے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی، حسین اور خوش رو آدمی ہیں، قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے۔ لیکن ابھی کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے۔ آگے کے دو دانت ٹوٹ

---

[1] معلوم نہیں کہ کس زبان کا لفظ ہے۔ مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا، سر پہ لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک بر کا سفید پائجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار چغہ[عله]۔ میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا، سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے ہیں، کوئی چالیس سال کی عمر ہے۔ انشاء پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نقشہ، خلاقی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک بر کا سفید پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے تھے، قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کر شانوں پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا، انہوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دو زانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے۔ میاں نیر تم کس وقت آن بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر لحظہ آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں۔ میری طرف دیکھ کر کہا۔ آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں، فرمانے لگے۔ حضرت آپ کے تشریف لانے کا مقصد مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو گیا تھا۔ کل

عله قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے، اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

ابھی میاں عارف آکر مجھ سے آپکے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیر تم بھی چلو گے نواب صاحب نے کہا جہاں آپ وہاں ہم۔ آپ تشریف لیجائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہونگا۔ مرزا صاحب نے پوچھا۔ مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے مجھکو انکا کل سے انتظار ہے۔ لے لو، وہ آہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے ابھی میں تم کو ہی پوچھ رہا تھا۔

نواب علاءالدین خان، علائی نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے، متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی داڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیم آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے، اور کہا واقعی آج دیر ہوگئی مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے، میری طرف دیکھ کر کہا آپ کی تعریف، مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا، علائی، تم کو بھی چلنا ہوگا۔ ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا، بہت خوب آپ تشریف لیجائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر نواب زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انہوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لیئے خالی کر دیا تھا۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اسکو جما جمایا پایا۔ کپڑے اُتارے اندر سے کھانا آیا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھکر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پہ پٹے ہیں۔ بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی۔ ایک بر کا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبہ پہنے اور سر پر چھوٹا

صاف باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہاں
جاتے ہو، میں نے کہا حکیم مومن خاں کے پاس۔ پوچھا کیا کام ہے میں نے حال بیان کیا
کہنے لگے چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان
تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اسکے چاروں طرف عمارت ہے دو طرف
دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے
سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے عہ۱۔ دالانوں
میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب
بیٹھے ہیں سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دو زانوں بیٹھے
ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے
کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے، سرخ
و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں،
کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی
آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے بازو۔ پتلی کمر، چوڑا
سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفیں پشت اور شانوں پر بکھری
ہیں کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں۔ کان کے قریب تھوڑے
سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا بیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن
اسکے نیچے کرتہ نہ تھا۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔

عہ۱ میں نے خود یہ مکان ۲۰، ۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت
دب گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا، معلوم نہیں اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم
مومن خاں نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے انکا انتقال ہوا خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی۔
"دست و بازو بشکست"

گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اسمیں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا۔ اور اسکے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت پاؤں میں سُرخ گلبدنی کا پجامہ، مہریوں پر سے تنگ اور اوپر جاکر کسیقدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک بر کا پجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سُرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹا کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈ کر آگئی تھی اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے، غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے جب میں اور مولوی صہبائی دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیاؔ سے کہہ رہے تھے کہ صاحب عالم تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں دو ہوں آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحب عالم نے کہا، استاد کیا کروں رزیڈینٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کر کے انکے پاس بھیج دیتا ہوں جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپکے پاس لے آتا ہوں حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا اسلام لے کر کہا بیٹھئے بیٹھئے۔ ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ میاں حیاؔ! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے تم کہتے ہو کہ سُرخ مہروں کو مات ہوگی۔ میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہوگی۔ تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کرلوں اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائیگی۔ اس کا جوڑا اٹئے پر آئے۔ سکھانند حکیم تھے رقم تخلص کرتے تھے۔ دہرم پورہ میں رہتے تھے۔ کوئی چالیس سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خانصاحب کے شاگرد تھے بڑے خوش

پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے، جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سُنکر بہت خوب بہت مناسب کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کرکے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے اے بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے کہو خیریت تو ہے اور آپکے ساتھ یہ صاحب کون ہیں۔ مولوی صہبائی نے کہا یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں حکیم صاحب نے ہنسکر کہا بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے، اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لیکر چڑھ آتے ہیں[عله۱] شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ، سبحان اللہ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعرا　　　تحسین نا آشنا و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہر بُدھو کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کراتے ہیں خود تو میدان میں آتے نہیں اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھکر کہ

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں　　　ناخنِ قوس میں فرقِ شبۂ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھکو کس قدر ناگوار گذرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا اونکے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں اب رہے میر صاحب[عله۲] تو انکی بات دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرہ میں کچھ چہل پہل ہو جاتی ہے، بھئی

عله۱ یہ استاذ ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ تھا۔

عله۲ ان کا مفصل حال آگے آئیگا۔ یہ ظلی مجسم تبسم تھے۔

میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے - میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے - حضرت ظل سبحانی کی غزل بھی آئے گی - فرمایا ہر شخص مختار ہے چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے - میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لیکر آیا - شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اسکا آنا لازمی تھا - ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا - کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے، جو مانگتا دیتے - اس سوداگر نے اگر ایک گٹھڑی مزدور کے سر پر سے اتاری اس میں سے پٹ ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے آملی اور دونوں ملکر ایک طرف چلے گئے[1] - ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے - جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا - کہو میاں رستم تم نے دیکھا - انھوں نے کہا جی ہاں ایک خلئے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی - میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اس کی معافی چاہتا ہوں - کہنے لگے - اس کا خیال نہ کرو انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے، میں نے جب دیکھا کہ خانصاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا - میں نے کہا مجھے تو اس مشاعرے سے بڑے نام تعلق ہے سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے - وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور اب انکو زندگی کی امید نہیں رہی، انکی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں - وہ خود حاضر ہوتے - مگر حکیم احسن اللہ خانصاحب نے انکو یہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے - یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا - خانصاحب بڑے

---

[1] یہ واقعہ ہے اسکے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوا انتقال ہوا ہے یہ واقعہ انکی زبانی سنا ہے

غور سے میری بات سنتے رہے میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ افسوس ہے۔ کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا، میری طرف دیکھ کر کہا۔ اچھا بھئی تم جاؤ۔ میری طرف سے عارف سے کہدینا کہ میاں میں ضرور آؤنگا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا۔ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستہ میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کہدینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے، مشاعرہ کہاں ہوگا اور "طرح" کیا ہے میں نے تاریخ بتاکر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ یہ کہکر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہوگئے اور میں سلام کرکے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک پیٹا محل میں نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں، مفتی صاحب کے ہاں جاکر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں میں نے کہا چلو اس سے بہتر دقع ملنا مشکل ہے دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا یہ سوچکر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے، اس میں مختصر سی نہر ہے سامنے دالان در دالان، اور پہلو میں انگریزی وضع کے

کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی تھی، گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی ابھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں بدن میں سفید ایک برکا پیجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ تھا۔[عله] جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دلی میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا، اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا تنگ مہری کا سفید پیجامہ، سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پچگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے، تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

میں اداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانوں بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں حکیم مومن خاں کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ میں: خانصاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے، بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے، یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے ہاں یوں

عله پرانے زمانہ میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانہ ہی میں گذرتا تھا، ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا۔ شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیے رہتے، جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے، ہر شخص دوزانو مودب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے، کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیئے کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

کہو، یہ بات ہے ورنہ مجھے تو یہ سُنکر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں اچھا ابھی عارف سے کہدیتا ہوں کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے، یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا وہ بھی مطمئن ہو گئے ہیں نے حکیم مومن خاں کا حسب حال بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے کہنے لگے۔ میاں کریم الدین تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے میں نے کہا نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں، ان پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا یعنی صاحب سے معلوم ہوا کہ اُنہوں نے مشاعروں میں جانے کا عہد کر لیا تھا۔ صرف آپ کی وجہ سے اُنہوں نے یہ عہد توڑا ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ میاں تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہ دیکھ سکتے۔ خیر اس کو جانے دو اب یہہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں، میں نے کہا جی ہاں بالکل خالی ہے، حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں۔ فرمایا نہیں بھئی نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے ملکر کسی کام میں ہاتھ ڈالا وہ خراب ہوا، تم اس انتظام کو بس مجھ پر ہی چھوڑ دو، بلکہ تم تو اُدھر آنا بھی نہیں، تم نے اگر آکر مین میخ نکالی تو مجھ پر دُہری تہری محنت پڑ جائے گی۔

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند	نشستند و گفتند و برخاستند

"تاریخ ابوالفدا" کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ ۸۰ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر گھر میں اُن کی صورت دکھائی دیتی اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا بہر حال یہ

آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آہی گئی - ۲۰ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجنے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا - نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے - گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی - ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا - کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں کوئی کہتا کہ اس سے کیا کوئی ہوں، مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا - کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے - سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کنور انتج رہے ہے -

مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے - صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے، مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے - یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں - گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا، واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا - کہاں بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ، واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا، چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی - جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ مگ، کر رہے تھے - صحن کو بھر دا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے - تختوں پر دری چاندنی کا فرش، اُس پر قالینوں کا حاشیہ - پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار - جھاڑ، فانوس، ہانڈیوں، دیوار گیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا - جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینہ سے - سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سنہری

ریشمی طنابوں سے استادہ تھا اسکے نیچے سبز[علہ] مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس کسے ہوئے، فانوسوں کے کنول بھی سبز چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے سروں پر مقیش کے کیچھے تھے، اسی طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے تھے، دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیہ سبز تھے کھنچی ہوئی تھی چھتگیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اسطرح کھینچ دیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور تنورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے، باورچیخانہ میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے چنا ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوشبو سے بڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے سے فاصلہ پر حقوں کی قطار تھی، حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دوکان پر سے اٹھ آئے ہیں، حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھ کر اُن پر خاصدان رکھ دیئے تھے، خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اسطرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک تہ پھولوں کی آگئی تھی۔ خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الائچیاں چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان اندر کافوری بتیاں،

علہ سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں کیوڑا، غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا۔ میں تو الف لیلیٰ کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی تھی[1]۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے یہ سلاطین زادے ہیں، کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنی برابر کسی کو نہیں سمجھتے بہت رحم دل خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں، غل فصل نام کو نہیں ہے، ملاح کہا کرتے ہیں کہ "کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اُترے سب سے پیچھے" انہوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے، مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہ چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے زور سے ابر آیا سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ ٹھہرے اپنی وضع کے پابند جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے، کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اُٹھے، مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دیکر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا ان بیچارے کے پاؤں میں روز کا قیمتی جوتا کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر جھینپتے جھینپتے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اس کا جوتا کیا تھا۔ لیتڑے تھے، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے اپنا جوتا بغل میں دبا لیا، قلعہ پہنچکر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا، میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو۔ آگے چل کر اس بدمعاش نے ان کو بہت دق کیا۔ اول تو اس نے ان کا منہ دورا

---

[1] بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہ اسی پر اس مشاعرہ کا نقشہ قائم کیا ہے

پیٹ دیا۔ دوسرے تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انہوں نے کبھی "ونا" نہیں کی جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کر دیتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش انکو لیا اور پوچھا میں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے۔ مرزا رحیم الدین حیا ان کے بڑے بیٹے ہیں لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے، نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے، نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے، جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں ان کا تو رنگ ہی بدل گیا میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا لکھایا شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتے خاں کو بھی معلوم نہ ہونگے، اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھکو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بنارس بھیج کر میں مصیبت میں آ گیا۔ ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دنتا کلکل اور ہول سے لی۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں رسا کو بیچا ایک جگہ بٹھا دیا ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمن احسان کو جھرمٹ میں لئے آ پہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو حکمت استاد ہیں پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا۔ مگر استاد ذوق کے قلعہ میں قدم رکھتے ہی انکا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے

؎ اتنے دن کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادہ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں، اس لئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

ٹکر لڑ چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی کمر دُہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانہ کے ملجم باعور تھے۔ لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی اُستادی کا سکہ ایک زمانہ سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا!

پہلے مرزا نبلی کے استاد ہوئے رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ تک رسائی ہوگئی وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے اس لئے اس نام سے تمام قلعہ میں مشہور تھے، مصرعہ پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسی تراخ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں

انہوں نے فوراً عرض کی

نامناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں

کسی نے "وقت سحر گاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا انہوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد
خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

بڑے دبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے۔

اے خال رخ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھکر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ ہم ننگے نشے میں جو رجھوتے

بھاگتے اندر آئے، نوجوان آدمی ہیں۔ مگر عجب حال ہے کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیشؔ سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی استاد ذوقؔ کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں۔ شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا۔ منشی جی یہ کیا رنگ ہے۔ کہنے لگے۔ اصلی رنگ۔ مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے، نواب صاحب نے کہا ابھی شروع ہوتا ہے۔ آپ بیٹھئے تو سہی۔ خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارفؔ نے ان پر ایک دوشالہ لا کر ڈال دیا۔ انہوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنیکا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہؔ، شیفتہؔ، صہبائیؔ اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اوّل ہیں، عجیب باکمال آدمی ہیں، مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں، اس لئے خود شعر نہیں کہتے۔ مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اسکو دوام کی سند دے دینا ہے۔ کوئی ۶۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائیؔ ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر

وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ کیا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگادی۔ ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر انکی عزت افزائی کی انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ [1]

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے، میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے۔ میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو بھی مات کر دیا سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام دیکھکر دل خوش ہوگیا۔ خدا تمہیں اس سے زیادہ حوصلہ دے۔ میں نے عرض کی۔ مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے۔ فرمانے لگے۔ بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے تم کہو نواب صاحب کا ہے چلو، ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو“ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں سے اترے۔ میر مہدی علائی، سالک اور حزیں ان کے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب آتے ہی مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا۔ بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر خاں محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت بہت سلام لکھا ہے، معلوم نہیں کہ کیوں یکا یکی پٹنہ چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہو کر انکا دہلی کو چھوڑنا مجھکو تو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے۔

نہ تو نامہ ہی نہ پیغام زبانی آیا
آہ محزوں تجھے یاران وطن بھول گئے

اے ہے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے۔ ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے۔ آخر یہ مشاعرہ

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے مگر نام نہیں لکھا۔ مجھے یہ واقعہ ان ہی کی زبانی معلوم ہوا سنکر تعجب ہوا تھا۔ اب ایسے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔

شروع کب ہوگا؟ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا۔ لیجئے مرزا صاحب وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں، دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں، میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمن ہے۔ پوربئے بسنوا کے ہیں، دہلی میں آکر حکیم آغا جان عیش کے یہاں ٹھہر گئے ہیں، اُن کے بچوں کو پڑھاتے ہیں، حکیم صاحب ہی کے مشورہ سے ہُدہُد تخلص اختیار کیا انہی کی تجویز سے چگی ڈاڑھی رکھی سر منڈا کر نکو عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے کھٹ بڑھی ہوگئے۔ انہی کے ذریعہ سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین شہیر الملک ہُدہُد الشعرا منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔
شروع شروع میں تو ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے استادانِ فن پر حملے شروع کر دیئے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو آخر آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہوگئی۔ اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا حکیم صاحب تو علانیہ اُن کی مدد کر نہیں سکتے تھے، خود انہیں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہوکر بیٹھ جاتے مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لئے مولانا صہبائی کے منہ سے "آپکے دوست" کا لفظ سنکر مرزا نوشہ مسکرائے اور کہا بھئی میں تو انکے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں، ان کے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا بڑا کام کیا۔ غرض یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آگئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ الٹ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے سیدھے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اس طرح کان تک لیجاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے

اور پھر چھوڑ دیتے ہیں چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں
قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں۔ شہزادے
ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے، وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی
ناک، لمبا کتابی چہرہ بڑی بڑی ملبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا۔ آنکھوں کے نیچے
کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، ڈاڑھی گلوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ، غرض جیسی
مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لگا
کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس
تھا۔ مگر اب دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب سلیمان شکوہ کا۔ اودھ گئے دربار

ع اس مضمون میں جا بجا دلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے
اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور بھی طرح پھر جائے
مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں، ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی
نہ ترکی نہ تاتاری، کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سے لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیر اوپر کے حصہ
سے ذرا بڑا رہتا، اسکے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا
کہ ٹوپی گرگنبج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں
سے ملا کر سی لی، اندر استر دے دیا، چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہروں میں کلاہ ترکی کا بہت استعمال
ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں، اور کئی طرح پہنی جاتی
ہیں۔ جو ٹوپی شرفاء استعمال کرتے ہیں اس کا (دمہ اگوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے۔ دستے کے اوپر چار پاکھے
پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں گوشوں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ
چاروں کونے مرک (کمرخ) کے نمونے کے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اسمیں ذرا جدت بھی کی
ہے، وہ یہ کہ دستے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر (بقیہ حاشیہ کیلئے صفحہ ۲۰۳ دیکھیے)

میں رسوخ ہوا - خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں جو وہاں جاکر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے - اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا -

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵) بڑھا دیا ہے اور اُن کے سل جانے کے جو پہل پیدا ہوئے ہیں ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں اس طرح بجائے چار پہل کی ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں - خوبصورتی کے لئے دمے کے کناروں پر تیلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک فیتون لگاتے ہیں ،

بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے اسی قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی - قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں - جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اس کے پاکھوں کو تو دبا دیتے ہیں مگر گوشے دمے کے باہر نکل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں ، اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے - اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین (عرق چین) کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے اسکا بنانا کچھ مشکل کام نہیں ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کی برابر سی لیا نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصہ میں چینٹ وغیرہ کا چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا - دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے برخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے - ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں - اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اس کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے گوشوں کے اوپر کے حصے ایسے ہوتے ہیں جیسے فصیل کے کنگرے ، نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے ، یہ ٹوپی قالب چڑھا کے پہنی جاتی ہے - قالب چڑھ کر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد - عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا - بعض تو بالکل سادی ہوتی ہے اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں -

(بقیہ حاشیہ کیلئے صفحہ ۱۶۹ دیکھئے)

اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں انہی کو دیکھ لیجئے جو شہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں اُن کے سر پہ دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتا اور تنگ پیجامہ ہے۔ جنہوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے جسم پر وہی پُرانا لباس ہے، سر پہ چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان، پاؤں میں گلبدنی یا غلطے کا پاجامہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ (٣٦) اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں۔ لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دہلی کے انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے چونکہ ہر شخص کو کثرت کا شوق ہے، اسلئے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لئے آستین بہت چست رکھتے ہیں اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر الٹ لیتے ہیں انگرکھے کے نیچے کرتا بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعہ والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے۔ بہت تکلف کیا تو اسکے حاشیوں پر سمور لگا لیا۔ نہیں تو عموماً تیلی لیس لگاتے ہیں، ٹھنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے۔ جسکو "عاشق و معشوق یا چشمے" کہتے ہیں۔ اسکی آستینیں نیم آدھی ہوتی ہیں، قلعے میں تو اسکو خفتان کہا جاتا ہے۔ مگر شہر والے اسکا سینہ کھلے نیم آستین کو "نیم تنی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر چوکور رنگین رومال تہہ کر کے مونڈھے پر ڈال لیتے ہیں، اس رومال کو عام اصطلاح میں ارغ چین (عرق چین) کہتے ہیں۔ کمر میں بھی تہہ کر کے رومال باندھنے کا رواج ہے، مگر بہت کم۔ پیجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے، اکثر گلبدنی، غلطے، مشروع، موٹرے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر ہی کا پیجامہ پہنتے ہیں۔ مگر تنگ مُہریوں کے پیجامے بھی چل نکلے ہیں سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے، پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہو گا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر لمبے چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بھی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے، تیل پلاتے، مہندی ملکر باورچی خانہ میں لٹکاتے۔ یہاں تک کہ اسکی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے۔ جو نکلتا اینٹھتا ہوا نکلتا ہے جس کو دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، بیٹھے ہوئے شانے۔ شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلیگا جس کو کثرت کا شوق نہ ہو، پھکیت، بانک، بنوٹ اور لکڑی

(بقیہ ٣٨ صفحہ پر دیکھئے)

ایک برکا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنو ہوتے ہیں انہوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہدیا ہے، چہرے کی ساخت سے انکو دہلی کا شہزادہ کہدو تو کہدو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیٹھ لکھنو والے معلوم ہوتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملاکر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کرونگا کہ جس کو جہاں چاہے بٹھادیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ ہوا نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُن کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہیئے تھا تو بجائے اس کے کہ اسکو وہاں سے اٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے، جہاں اسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے۔ ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا۔ وہ آکر اُن کے پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جس کو وہ خالی جگہ کیلئے موزوں سمجھتے اس سے کہتے تشریف رکھئے وہ جگہ خالی ہے۔ جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح نشستوں کا انتظام ہوجاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا اور ٹیڑھی کھیر ہے ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم یہاں بیٹھیں پھر لاکھ منایئے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لئے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انہوں نے خود کرلیا، مگر اس طرح کے کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے صاحب عالم ادھر آیئے کسی سے کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے، کہتے بیٹھو بھئی بیٹھو غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے استاد اور انکے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں میں

نہ جاتا ہو بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

بٹیریں دبی ہوئی تھیں، یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے روزانہ تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں، ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی بدڑیاں۔ جہاں چاہا چھکڑا لے گئے اور بدڑیاں اُڑا دیں، ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ چھکڑے سے ایک بھی چھٹ کر نہیں جاتی، انہوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اُڑیں، انہوں نے آواز دی اور وہ آ کر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک ہوادار میں سوار آپہنچے اُن کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی، رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی زباہٹ ہے، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا سبز گلبدنی کا پیجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال، ہیں تو ابھی نوعمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں، غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگایا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے[1] اور اتر کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے ان کا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سروقد کھڑے ہو گئے، چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے۔ سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لئے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا ادھر عصا بردار تو ان کے سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہو لئے۔ اس سلسلے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب

[1] مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہو گیا تھا اور اسی نسبت سے داغ قلعہ میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا)۔

کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا، پھر چاروں طرف نظر ڈالکر کہا اجازت ہے سب نے کہا بسم اللہ، بسم اللہ
اجازت پاکر شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے
کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈالکر کہا۔ تشریف رکھئے۔
تشریف رکھئے۔ سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے استاد ذوق نے داغ کو اپنے
قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے
پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے، جب یہ سب انتظام ہو گیا
تو نواب زین العابدین خاں آگے بڑھے، شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجالائے
اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے، چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھکر اپنی
جگہ جا بیٹھے ان کے اٹھ کر چلے جانیکے بعد نواب فتح الملک نے دونوں ہاتھ فاتحہ[1] کو اٹھائے۔
ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا۔ خوشنوایان
چمن دہلی! میری کیا بساط ہے، جو آپ جیسے استادان فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ
بننے کا خیال بھی دل میں لاسکوں، صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر
خدمت ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی، مجبوں
اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اسکے لئے کوئی "طرح" نہیں دی گئی
اسکی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی
جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ
بند کر دیا ہے، اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر کے جو خیالات طبیعتوں
کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے، مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال
بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے لیکن، اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے

---

[1] نواب فتح الملک بڑے کٹے مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ خیر کے شروع نہ کرتے تھا اسی لئے سب قلعے
والے ان کو "ملا" "ملیتا" کہلاتے تھے۔

چنانچہ حضرت ظلِ سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اسکے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کرکے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔ یہ کہکر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اٹھا کر اُن کے سامنے لائے۔ انہوں نے بسم اللہ کہکر فانوس آتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبداروں نے شمعیں بیچا کر لگنوں میں رکھدیں، اور سیدھے کھڑے ہوکر مرزا فخرو کی طرف دیکھا، انہوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باآواز کہا "حضرات مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔"

اس آواز کا سُننا تھا کہ سناٹا سا ہوگیا۔ قلعے والوں نے بٹیریں تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھدیں، نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان، اور پن دبیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کر کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لئے ہوئے قلعے سے آیا اس کے ساتھ کئی نقیب تھے۔ وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجالایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی۔

حاضرین! حضرت ظلِ سبحانی صاحب قرآن ثانی خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے، نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمایا جائے۔

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سروں میں پڑھنا شروع کیا الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادان فن ہر شعر پر جھومتے تھے کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا۔ لیجئے آپ بھی پڑھیئے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا۔ کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب رہیگا جہان میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
دے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اسکو نہ جانیگا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی۔ جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زر افشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا

جاتا تھا، مرزا فخرو نے کاغذ لیکر ادھر اُدھر دیکھا۔ ملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ صاحب عالم ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیجکر سرکار سے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں، بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔ مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا۔ اُس نے عرض کی قبلۂ عالم! میں یہ پیام جاتے ہی پیش گاہ عالی میں پہنچا دوں گا۔ خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔ یہ کہکر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواصی کو دیا۔ اُسنے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھکر یہ غزل سُنائی۔

دل سے لطف و مہربانی اور ہے	مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے	عشق کی میرے کہانی اور ہے
روکنے سے کب میرے رکتے ہیں اشک	بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے آدا راتھ کب ہوتے ہیں قفا	اُن کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھیکی سیٹھی تھی، مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگر تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے، بعض قلعے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواصی تو غزل پڑھ رخصت ہوا اور اب خاص جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے دونوں شمعیں لا شاہزادے کے سامنے رکھدیں صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا۔ بھلا میری

کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں، البتہ جو کچھ برا بھلا کہا ہے وہ نظرِ اصلاح عرض کرتا ہوں۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

حال کھل جائیں غیر کے سارے
پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

وِرد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

وہ تو ملنا پہ آئے دل کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبانِ رقیب
کھیل ٹھہرا کوئی گلہ نہ ہوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے ہوا، ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اٹھانے کو
رہ مرا اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے۔ مگر ان دونوں کو انہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آ کر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا سبحان اللہ! صاحبِ عالم سبحان اللہ۔ واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزہ آ گیا، استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے مرزا فخرو نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا۔ یہ آپ حضرات کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا اس نے شامیانے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا سامنے کی صف میں میاں بل کے آگے رکھ دی نام تو ان کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں بل کہتا تھا۔ ان کو بھی اپنی طاقت پر اتنا غرور[1] تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے جو کچھ

[1] اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا۔ ان کا زور [illegible] ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گزرا [illegible]

اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کو جواب میں اُن کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے تخلص بل رکھتا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے

(بقیہ صفحہ ۴۴) استاد حاجی علیخاں نے ایک پٹھا تیار کیا بدن میں آ کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ مگر داؤں پیچ میں طاق تھا، اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں ایک دن جو میاں بل نے حسب معمول شیخو آلوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا اکبڑے آثار پیترا بدل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا، میاں بل کو ہنسی آ گئی بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کریگا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا استاد علی جان نے کہا کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا، کہنے لگے اُستاد۔ جوڑ تو دیکھو لو خواہ مخواہ اس لونڈے کو پسولنے سے حاصل۔ استاد نے کہا، میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا۔ یہی ہوگا کہ ہڈی پسلی تڑوا اگر آئندہ کو کان ہو جائینگے۔ بہرحال دونوں کے ہاتھ مل گئے اور تاریخ مقرر ہو گئی، اس مشاعرے کے دو چار دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے، دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے میاں بل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی، پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن چادریں پھینک دنگل میں اترے۔ اترتے ہی دونوں نے "یاعلی" کا نعرہ مارا دو چار ڈھکالیاں کھائیں کچھ مٹی چڑھ کر سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو ہاں آواز تھی تو یاعلی کی یا خم ٹھونکنے کی میاں بل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا وہ آگے کو جھکا یہ کمر پر آگئے وہ جھٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انہوں نے اسکا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤ زوری کر کے اسکو دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اسکو دبا ہی بیٹھے وہ چپکا پڑا رہا انہوں نے بیتے کس لئے تھوڑی دیر تک اسکو خوب رگڑا وہ وہ سیدھے چلا گیا، انہوں نے پہلو میں اکشکر اس کا سینہ کھولنا چاہا وہ بھی موقع تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے اسس نے ٹانگ پر باندھ جو اڑایا تو میاں بل چاروں شانے چت جا پڑے لونڈا اچک سینہ پر

اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی۔

کہدو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے — ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے
خط نے بڑھا دیا ہے مزا خط سبز نے — ساقی نے پشت دی مئے صافی کو نبک سے
دل اب کے پلے طرح سے پھنسا زلف یار میں — نکلے یہ کیونکہ دیکھئے قیدِ فرنگ سے
آجائیو نہ بیچ میں ظالم کے دیکھنا — یاری تو تم نے کی ہے اس شوخ و شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا مرزا علی بیگ کے سامنے لکھدی یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے، نازنین تخلص کرتے ہیں، دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً گہرے سرخ رنگ کی تاروں بھری اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا۔ ایک پلو کا کل مارا، دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا، اور خاصی بھلی جنگلی عورت معلوم ہونے لگے، غزل ایسی لہرا لہرا کر اور آنکھیں نچا نچا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا، نرت ایسا پیارا کرتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کریگی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزا آیا مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جوان تاکا — برا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو — نہیں ڈر نے کی میں بھی ان نہیں تاکا تو اب تاکا

(بقیہ صفحہ ۱۷۵) سوار ہوگیا، وہ مارا وہ مارا کی آوازوں سے جنگل ہل گیا لوگوں نے دوڑ دوڑ کے گود میں اٹھا لیا کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں بل کہاں پڑے ہیں، یہ بھی چپکے سے اٹھ چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی، جنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لئے دہلی سے گئے، تھے بڑے غیرتمند وہ دن اور آج کا دن پھر انکی صورت نظر نہ آئی خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

اگر اے نازنیں تو بولی تیلی کامنی سی ہے   چہرہ سا بدن، نام خدا ہے تیرے ٹھا کا

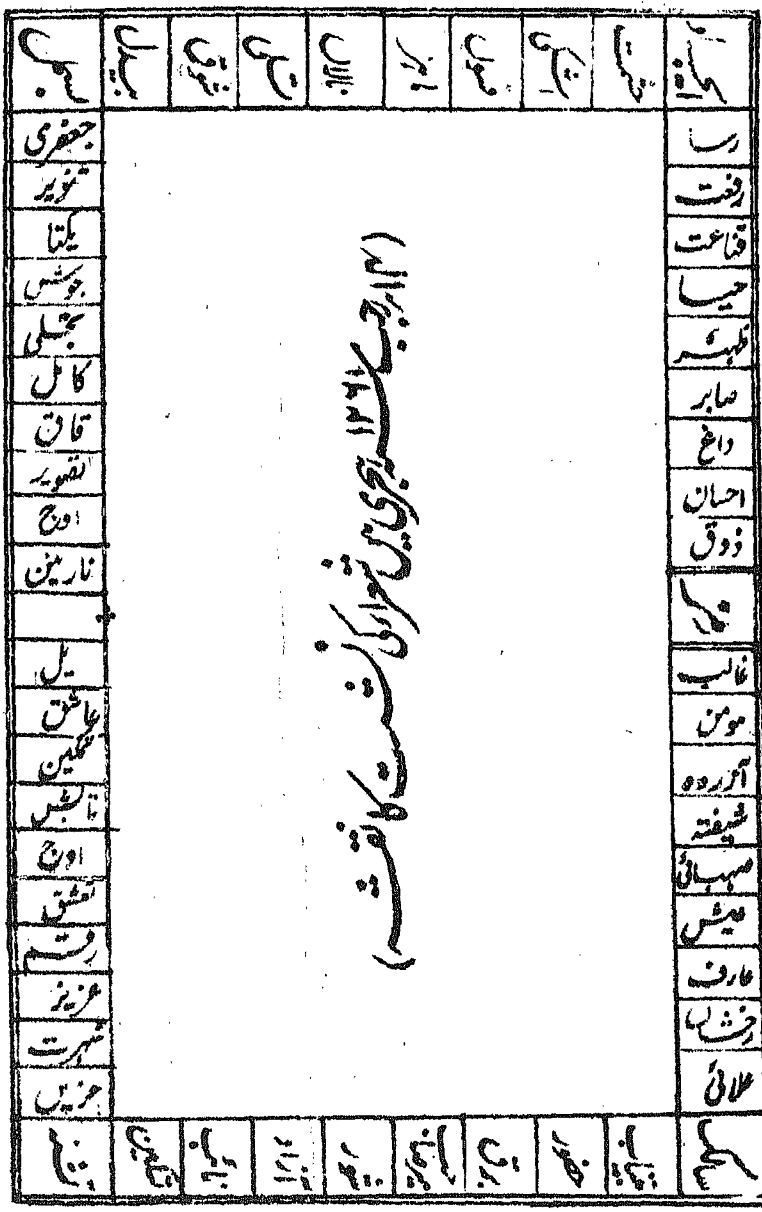
اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اُلٹی طرف کا نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آ گئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں اس مشاعرہ میں ایک شعر ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ، لکھا ہے:

فقط تو ہی نہ میرے لئے بت خونخوار دشمن ہے
تیرے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی، ان کے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں اوج کے سامنے رکھدی گئی، یہ بڑے پرانے ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق شاعر ہیں مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی اُن کی سمائی مشکل ہے اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں اور خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آ کر صف مجلس سے گز دو گز آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا آج بوتا ہے جو ان کو استاد نہ کہکر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انہوں نے شعر پڑھا اُدھر استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور ان کے تیور بدلے۔ ان کے غصہ کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی جب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا   ہے پل صراط تریں، یہ ہے کمال اپنا

نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور شاعروں کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔



طفلی ہی سے ہے مجھ کو وحشت سے نفرت ……… سم میں گڑا ہوا ہے، آہو کے نال اپنا
کسبِ شہادت اپنا ہی یاد کسکو قاتل ……… سانچے میں تیغ کے سے لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ موڑتا ہوں ……… (رکھ کے) دیوی کے آستاں پر سیم پلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے، کہنے لگے، واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے، بھئی واللہ الفاظ "رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں، میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپا ہوئے جاتے ہیں، جب ذرا سکون ہوا تو سید ہی طرف کی شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں، نازک نازک نقشہ سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہو نگے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے یہ غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا ……… کس دل جلے کی بارِ خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہو جیو ترا عشق بے حیا ……… آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا ……… رہتا خدا تھا جس میں وہ بارگاہ تھی
تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا ……… جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا استاد احسان نے کہا میاں یوسف! کیا کہا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کئے جاؤ ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ بے اُستادے رہے تو بھٹک نکلو گے۔ میاں تمکین نے مسکرا کر کہا۔ اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں کل ہی انشاء اللہ اُستاد اُوج کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ اُستاد ذوق نے کہا ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔ یہاں یہ باتیں ہو

ہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بن بھی کہتے ہیں الف کے نام سے نہیں جانتے، مگر طبیعت غضب کی پائی ہے، پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے بعد میں ان سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آملے۔ بھاری بدن، منڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پیجامہ اور سوسی ہی کا کرتہ کندھے پر لٹھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی بیجا ہے۔ نیچہ بندی پر گذر اوقات کرتے ہیں بڑے پُرگو شاعر ہیں لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لئے جو کچھ کہتے دل و دماغ میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یادداشت بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر جھک جاتے ہیں ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ سمجھو لسان الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی بہترین مثال ہیں غزل کہی تھی۔

ہجر کی شب تو سحر ہو یارب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا بھی نہ کھنچئے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لا یا تم کو — آپ کی خیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل ختم ہوئی تو استاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ خاں صاحب یہ میاں بن بھی غضب کی طبیعت لیکر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک انکے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی، کل ایک غزل سُنائی تھی میں تو پھڑک گیا ایک شعر تو ایسا بے ساختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ہاں میاں بن وہ کیا شعر تھا۔ میاں بن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل زبان پر آگیا۔ مطلع تھا۔

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ گئی
پہلو سے دل میں، دل سے کلیجہ میں جا لگی

اور یہ شعر تھا

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دلربا لگی
لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا ۔ میاں تپن یہ! یہ خدا کی دین ہے یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی ۔ میاں خوش رہو ۔ اس وقت دل خوش کر دیا ۔

ان کے بعد شمع محمد جعفر تابش کے سامنے آئی ۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، بہت دنوں سے دلی میں آ رہے ہیں ۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں، شاعری سے دل لگاؤ ہے ۔ کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں نہ پہنچتے ہوں، غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں ۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے
توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دلمیں خوش ہیں عدو، پہ اے تابش
وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ: واہ واہ نکلی، مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے ۔

تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں تلق کے آ گئی، خدا ان سے محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں، عبد العلی نام ہے ۔ مدراس کے رہنے والے ہیں، کوئی ۴۰ برس کی عمر ہے ۔ بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے، حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے ۔ ہزاروں کو تعویذ کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا ۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں، شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں، مگر دل کا خدا مالک ہے ۔ شعر خاصے کہتے ہیں ۔ لکھا تھا ۔

خم شراب خم گرد دل تو بن گیا
ساقی نہ دے او پیالہ اچھال کے
ہم مشربوں میں چلتے قاق منکشی کرو
جھگڑے سے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے آئی ۔ ان کی غزل میں وہی

ملہ ۔ آئندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع پڑھی یا الٹی جانب کی (باقی بر صفحہ ۵۲)

شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی باقی کے تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اُس جانِ جاں کے دیر ہو ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے
ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

اُن کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص کرتے ہیں مشاعرے میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ جھلک رہا ہے۔ اُن کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں۔

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ بات میں نے کہکر جب اُس سے داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی ‏ ‏ ‏ ‏ تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد تعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں ۶۳ ۶۴ برس کی عمر ہے حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں، مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں اُسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں، شعر بُرا نہیں کہتے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چونک اٹھے اور ہر شخص کے منہ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی انکا کلام دیکھیے

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر ‏ ‏ ‏ ‏ رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن ‏ ‏ ‏ ‏ کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ‏ ‏ ‏ ‏ ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی۔ مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی اس لئے ذرا آزردہ سے ہو گئے ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں

بس یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں، کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زباں پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں، کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں۔

میری وفا پہ تجھے روزِ شک تمہارے ظلم ۔۔۔ یہ سر، یہ تیغ ہے، اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلی نے ۔۔۔ کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پڑھتے خوب ہیں جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی انہوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بجھانا آتشِ دل کا بھی کچھ حقیقت ہے ۔۔۔ ذرا سا کام تجھے چشمِ تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے ۔۔۔ گیا اُدھر جو گزر پھر اِدھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے ۔۔۔ نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا اس کی انہوں نے بہت ریف کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا۔ میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ن دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردانِ ذوق ذرا سنبھل بیٹھے جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں ان کی عمر تو ۱۸-۱۹ سال ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر ں دھوم ہے مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ ئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پہ اُٹھا لیا استاد وق نے بھی سبحان اللہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل یہ تھی مجھے ممکن ہے کہ میں نے غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں — بے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں
قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب — جس درد کا کہ چارہ نہیں چارہ گر نہیں
قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں — وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں
سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شرابی — اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کرلی، میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں ہے جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں ہائے کیا شعر نکالے ہیں، لکھتے ہیں۔

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا — جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا
کچھ فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا — منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا
ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہے سر — اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا
مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا — اسمیں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا
اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورت نیاز — یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہئے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی استاد ذوق نے بھی کہا بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اسکی عمر میں برکت دے ایک دن بڑا نام پیدا کرلیگا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا سرکار سے خطاب خاقانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے

شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا آجکل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئیگا میرا بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی، بڑے جلے ہونگے بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرے۔

اُٹھے آہ شعلہ زا جس و خار بھی نہیں — نو آسماں ہیں نہ بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کسکو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے — لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراق یار میں وعدہ کی لاگ پر — آسان گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں۔ مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اتر جاتا ہے، ہر شعر پر تعریفیں ہوئیں اور کیوں نہ ہوتیں ہر شعر تعریف کے قابل تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر — یہ تو جلنا روز کا اے سوز ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہ میں — خاک کا پتلا بنا پتلے سے انساں ہو گیا
کفر دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب — اس کے کھلتے ہی یہ کار مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا — کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں زانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے۔ واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے اعجاز ہے، یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے، ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوائے خدائی اُس بت کافر کو تھا۔ کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان

ہوگیا۔ غرض اس شعر نے ایک کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لیکر جھومتے اور جوش واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے بڑی دیر میں جاکر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خاں تنویر کے سامنے گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲-۳۳ برس کے ہونگے بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ انکی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سُنی غزل بھی معمولی تھی صرف یہ قطعہ خاصہ تھا۔

جان کر دل میں مجھے اپنا مریض تپ غم | کہتا لوگوں سے نظاہر بت عیار کیا
رنگ رُخ زرد ہے، تپ جسم ہی، الٹی دم سرد | پوچھتا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہی کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضع دار آدمی ہیں، عارف کے شاگرد ہیں، ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے۔

سبو سے منہ لگائیں گے اب اتنا صبر ہے کسکو
کہ بھرے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس روز مشاعرہ میں پڑھی تھی اُس کے یہ دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے کوچے میں آگئیں | اللہ ری وسعتیں تری اتنے سنگنائے دل
جل جل کے آخر ش تپش غم کے ہاتھ سے | اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل
دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سُنا نہ تھا | اور دیکھئے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر جس کا بھائی شاعر جس کا سارا خاندان شاعر، وہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی

غزل میں زور نہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ غزل تھی۔

تیغ یوں دل میں خیال نگہ یار نہ کھینچ — ناخدا ترس تو کعبہ میں تو تلوار نہ کھینچ
بے سرو پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر — ناز ہر گل نہ اُٹھا منت ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہوئی، وجہ یہہ ہے کہ یہ رنگ اب دلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں، اس میں اگر مضمون پیدا ہوگیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اسکو اب چھوڑتے جارہے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی، چوبدار اُن کے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا انہوں نے آنکھہ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے اُس نے شمع رکھدی جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کردی اور کہا میں بھی کچھ عرض کروں، سب نے کہا ضرور فرمایئے انہوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھہ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے، پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے ایک تیری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نکرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت، غرض یہہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے، ادھر یہ عالم طاری تھا، اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے "اور کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اسی عالم بیخودی

میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"۔

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا۔ ہاں صاحب پھر شروع کیجیے شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی بھلا آتش کے بعد ان کا کیا رنگ جمتا۔ اوّل تو یہ نو مشق ہیں مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں، دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے او بت کافر اٹھا لیا — اس نازکی پہ بوجھ یہ کیونکر اٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا
پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہرحال کسی نے سنا کسی نے نہ سنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہونچ گئی۔ اُن کی عمر کوئی ۴۰ برس کی ہوگی، صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے ان کا خاندان دہلی میں بہت مشہور رہا ہے، انہی کے دادا امیر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا، سپاہی پیشہ آدمی ہیں، شعر بھی بُرا نہیں کہتے۔ لکھا تھا۔

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلیٔ دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
شبِ وصال میں سننا پڑا افسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گذار مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزہ یہ دیکھیے ہے آغازِ عشق میں تسکیں — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر بیٹھے

استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی انہوں نے یہ غزل پڑھی۔

نگہ کی چشم کی، زلف دوتا کی
سہے اک دل جفا کس کس بلا کی

کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے
ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی

بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل
تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھیکی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا، ہاں اسکے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزہ آگیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کتاں وار جگر چاک ہوا
پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا

کہیے اُس بت کو مشابہ کس کے
دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا

عہد پیری میں جوانی کی امنگ
آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھک جاتے تھے جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی، بیچارے بڈھے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو انکا استاد کہا کرتے ہیں۔ اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں۔ مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں غزل جو پڑھی تو واقعی اسکا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

لکھا ہوا ہے یہ اُس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر

استاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی، غرض جتنے استادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی اور انہوں نے ذوق کی طرف دیکھکر کہا۔ دیکھا شعر یوں کہتے ہیں، وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، اُن کے ایک، آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا۔ مگر انہوں نے روک دیا۔

خدا خدا کرکے اُن سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الگزنڈر ہیڈرلے ہے، قوم کے فرانسیسی ہیں، دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے، کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے ڈاکٹری بھی جانتے ہیں شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں جہاں مشاعرے کی خبر سُنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے۔ مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں، ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

وہ گرم روِ راہ معاصی ہوں جہاں میں — گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا
کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو گردشت نوردی — ہاتھوں سے مزا دیکھ ذرا جیب دری کا
چہلم کو عیادت کے لئے وہ مرے آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی، بیچارے غریب صورت فرسودہ لباس کوئی ۶۴-۶۵ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف میں جا رہے ہیں، مشاعرے کی کشش کبھی کبھی اُن کو دہلی کھینچ لاتی ہے، پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو، غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر چڑھی ہے حضرتِ دل — پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی

جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں ق تم گلے سے مرے لگو تو سہی
بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں خیر ہے کچھ پرے ہٹو تو سہی
غیر کے گل و ملگ کے چھاتی سے ق مجھ سے کہنے لگے، سنو تو سہی
اس لئے اُس کے ہم گلے سے لگے کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہوئی کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہو گئی تھی اسکے بعد جو ایک دو غزلیں ہوئیں وہ بس ہو گئیں نہ کسی نے شوق سے سنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شورش نے غزل پڑھی۔ یہ کونل کے رہنے والے ہیں، قوم کے عیسائی ہیں، اور نام جارج پیش ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں، جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت غنیمت ہے۔ غزل

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض دیکھے سے جسکی حالت عیسیٰ تباہ تھی
بل بے یہ بیخودی کہ خودی ہی بھلا دیا ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی
دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا جس سمت سر جھکا دیا بس سجدہ گاہ تھی

اس کے بعد محمد عسکری نالاں کی باری آئی بھلا اس نوے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفی کے سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے کہے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے
وہ بدگماں ہوں کہ اس بت کے سایہ پر مجھے رقیب کا ہی سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاں نے پڑھنا ختم ہی کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکھنا ہی تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ لیں، بعض منہ اٹھا اور پانی کا چھینٹا منہ پر مار آ بیٹھا۔ کیسی نیند اور کہاں کا

سونا میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو پر بیٹھے تھے
انہوں نے بھی پہلو بدلا، استادان فن کے چہروں پر مسکراہٹ آئی، نوجوانوں میں سرگوشیاں
ہونے لگیں۔ میر صاحب بھی صف سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا میر صاحب یہ ٹھیک
نہیں۔ آپ تو بیچ میں آکر بیٹھئے، یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا اُس نے دونوں شمعیں اُٹھا
وسط صحن میں رکھدیں، میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ شامیانے کے عین سامنے آبیٹھے
بھلا دہلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا۔ کونسا مشاعرہ ہے، جو ان کی وجہ سے
چمک نہیں اُٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں انکے قدم کی برکت سے رونق نہیں آجاتی ان کا
نام تو شاید گنتی کے چند آدمی جانتے ہوں ہم نے تو جب سنا ان کا نام میر صاحب ہی
سُنا۔ کوئی ۷۰ برس کی عمر ہے بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں، غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ
جیسی ناک، پٹا دہانہ، لمبی ڈاڑھی بیٹھا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت اونچا قد، غرضیکہ
انکے حلیے کو دہلی کے کسی بچے سے بھی پوچھئے تو پورا پورا بتادے۔ نہایت صاف ستھرا لباس
سفید ایک برکا پیجامہ، سفید کرتا، اس پر سفید انگرکھا، سر پر ارخ چین (عرق چین) ٹوپی
چہرے پر متانت بلا کی تھی مگر جب غصہ آتا تو کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے، چھوٹا ہو یا
بڑا۔ کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا۔ اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے
کہ منہ پھر جائے۔ اس سے انکو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں میاں
تمکین سے لیکر بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے تھے انہوں نے نہ ان کا بُرا مانا
نہ اُن کا جواب دینے میں۔ اُن سے رُکے نہ اُن سے، غزل ہمیشہ فی البدیہہ پڑھتے تھے
لکھکر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی
صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا
شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے، جب کہتے کہتے
تھک گئے تو ردیف اور قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ انہوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور

چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہو گئی۔ یہ بھلا کب دبنے والے آسامی ہیں جو لکھارتے جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آ کر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھا یا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا، یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب[علیہ] نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا حضرات! میں آج میاں ہدہد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں، اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔

میاں ہدہد سنے سب جلے بیٹھے تھے اب جو سنا کہ اُن کی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے سب نے کہا ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے۔ میاں ہُدہُد حکیم آغا جان عیش کے بیٹھو تھے اور انہی کے بل پر پھدکتے تھے، اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ہُدہُد کی ہجو پر اُتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھکو بھی نہ لپیٹ لیں، دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے، بھلا میر صاحب کی بحرِ طویل کا کون جواب دے سکتا ہے اور تو کچھ بن نہ پڑا میاں ہُدہُد کو گاؤ تکیے کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب اُدھر نظر ڈالتے ہیں تو ہدہد ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے ادھر دیکھا اُدھر دیکھا جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا، ہجو ملتوی کر کے اب میں غزل پڑھتا ہوں۔

[علیہ] غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے، میاں کالے صاحب کے فرزند نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے اس مشاعرے کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت موجود ہیں انہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کئے گئے، تذکروں میں تو ان بیچارے کا کیوں ذکر آنے لگا۔

سب نے کہا۔ ہیں! میر صاحب، یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا، پڑھیئے میر صاحب خدا کے لیئے پڑھیئے۔ سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائیگا۔ زبان ادھوری رہ جائے گی۔ میر صاحب نے کہا، نا بھئی نا میاں ہجو ہوتے تو جو کچھ ہم کو کہنا تھا ان کے منہ پہ کہتے۔ ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں غیبت ہے اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں، جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انہوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی کیا پڑھا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ، تیر، پیر، کھیر قافیہ اور "ہے" ردیف ہے اسکے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا۔ اور تعریفیں شروع ہوئیں کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا میر صاحب نے کہا۔ مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سُنی سُنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول[1] پڑھیئے مطول جب معلوم ہوگا بحر طویل کس کو کہتے ہیں، مولوی صاحب بڑے چکرائے۔ کہنے لگے میر صاحب بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا

---

[1] علم معانی اور بلاغت پر علامہ تفتازانی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

اُنہوں نے کہا، مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے کہنے لگے، جی ہاں، مولوی صاحب آپ سمجھتے ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ ابھی حضرت میں تو روز آموختہ اس کے دو دور کرتا ہوں کل ہی اسکی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحوں میں لکھا۔ وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔ مرزا نوشہ نے کہا، میر صاحب آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ اماں کو جانتے ہو اُس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے یہ بڑی بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے، میر صاحب نے بڑے زور سے "و ہائیں" کی اور کہا واہ مرزا صاحب سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں، بھلا بتائیے تو سہی کونسی کتاب میں ہیں۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین[عله] پڑھئے تب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کونسی ہیں۔

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انہوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں جب لوگ اعتراض

عله اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے فرمایا۔ حضرات! غزل ختم ہوئی، سب نے کہا میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں ہے مقطع کی یہ کیسی غزل۔ میر صاحب نے فرمایا۔ مقطع کی اُس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہے یہ غزل میری ہے ہمیں اسکی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہوگیا کہ یہہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی، یہ کہتے کہتے اُنہوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آبیٹھے۔ ایک شمع اٹھاکر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھدی گئی، یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا۔

ہم بھی ضرور کعبہ کو چلتے پر اب تو شیخ ۔۔۔ قسمت سے بتکدہ ہی میں دیدار ہوگیا
ناصح کی بات سننے کا کسکو یہاں دماغ ۔۔۔ تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہوگیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں ۔۔۔ اک پارسا سنا ہے کہ میخوار ہوگیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار اتار دیا تھا اس لئے غزل کی جیسی چاہئے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔

اُن کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں، کوئی ۲۰ - ۲۲ برس کی عمر ہے سر پہ لمبے لمبے بال۔ سانولی رنگت اس میں سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد،، وجیہ صورت۔ سفید غرارہ دار پیجامہ، سفید انگرکھا، دوپلڑی ٹوپی بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں، پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے، آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے۔ غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ واہ! کہتے ہیں۔

بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے ۔۔۔ ورنہ ایک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑے ... ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزا ہے یہہ ترے روٹھ کے من جانیکا ... چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک ... میں خدا اسکو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے ہیں در گزرا ... کچھ تو ہو جس سے طبیعت میری یکسو ہو جائے
ہو ہو بس میں کوئی، کچھ نہیں اسکی پروا ... دل بیتاب پہ لائے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا اسکو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھاگئی، اور تو اور استاد ان فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔

ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی یہ نوجوان آدمی ہیں، مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں، ان کا کیا کہنا زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں، ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دل مضطر کہ تیر کا ... باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ دل یہ میرا بیٹھا جاتا ہے ... ظاہر میں تو الہی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دیئے ہیں آخر کیوں نہ ہو قلعے کے رہنے والے ہیں۔

ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں، کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ اس پر سفید لباس۔ بغل میں انگوچھا، کندھوں پر سفید کشمیری رومال، بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے ہی جایئے، شمع سامنے آئی تو انہوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا، سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت   جو اٹھ کھینچیں دامن ہم اُس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے   کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی لڑکھڑا کر بیٹھ گئے "نہ ہاتھوں میں طاقت کہہ کر ہاتھ اُٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اُٹھ کر رہ گئے دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے، جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھکر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا کر چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کے بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا کہ "اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ استاد ذوق نے کہا۔ استاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے، سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے۔ ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد جیسا ہی استاد چاہئے۔

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین آشکی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ برس کی عمر ہے۔ اونچا قد سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا۔

کچھ وجہ نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف   کافی ہے یہاں نالہ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر آشکی   معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علیخاں بیتاب کے سامنے آئی ۳۰، ۳۲ کا سن ہو گا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے انہی کے ساتھ مشاعرے میں آ گئے تھے، بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر قطعہ یہ تھا

تعریف نہیں ہو سکتی، میخانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ، ہائے لکھا ہے۔

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ — ساقی اگر نہیں ہے، نہ ہو ہمیں سے کام ہے
بیتاب پی خدا نے تجھے بھی دیئے ہیں ہاتھ — یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا، نہ کلام ہی اچھا، نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے، خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں خوش ہو گئے، غزل یہ تھی۔

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن — یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے — مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں اُن کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے، اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کریگا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سُنی جاتی اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرے میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لیگا۔ چھوٹا سا قد دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی کلوں پر کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، سر پر خشخاشی بال کوئی ۳۰ سال کی عمر بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف نیچی چولی کا انگرکھا۔ تنگ مہری کا پیجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے انہوں نے بھی انگرکھے کی آستینیں الٹ ٹوپی کو اچھی طرح جمایا اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انہوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھکر عرض کی "اجازت ہے" مرزا فخرو نے کہا ہاں، میاں سالک پڑھو۔ آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے، سالک نے جیب میں سے

کاغذ نکالا کچھ اُلٹا پلٹا پھر ایک بار سنبھل کر کہا، عرض کیا ہے۔

انتہا صبر آزمائی کی ہے درازی شبِ جدائی کی
ہے برائی نصیب کی کہ مجھے تم سے امید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرتا وصال تسادیِٔ مرگ تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پر جسقدر اس نے خود نمائی کی
کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی ایک ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا، ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں۔ اور ایک ایک بندش کی داد ملتی اُستاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا۔ واہ میاں سالک کیا کہنا ہے سب ہی جبہ سائی باندھتے آئے ہیں تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا کیا روانی ہے سبحان اللہ۔ حکیم مومن خاں نے کہا میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر پارسائی"، کو بہت دن پڑے ہیں۔ ابھی سے تو بوڑھوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ میاں سالک نے جواب دیا۔ استاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا۔ دیکھئے بڑھاپا دیکھنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھریگا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے، ہم نہ رہیں گے مضمون رہجائیگا۔

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴ ۲۵ سال کی عمر ہے، شعر کہتے ہیں مگر پھیکے۔ ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں گانا خوب جانتے ہیں

انکی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی ۔

بت خانے میں تھا یا کہیں کعبہ کہ گھر میں تھا — اے زاہدِ ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل وہ بلا ہے، وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں — ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں اون کے گانے میں مزہ آ گیا ۔ گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ قلعہ سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے ۔

ان کے بعد شمع نواب علاؤ الدین خاں علائی کے سامنے آئی انہوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں اچھے شعر کہتے ہیں، کیوں نہ ہو کس کے شاگرد ہیں، غزل دیکھو تو استاد کا رنگ غالب ہے

آوارگانِ گلکدۂ آرزو — حاشا اگر تمہیں سرِ سیر و فراغ ہے
رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشمِ دل — یہ کچھ سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدحِ موجِ خیر رنگ — وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
کل جو رکل ہے سنگِ جفائے سپہر سے — گویا کہ غمکدہ کا شکستہ ایاغ ہے
اور لالہ تندبادِ حوادث سے خاک و خوں — گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز — اُس جا پہ آج دلشکن آوازِ زاغ ہے
مغرور جاں سے یہ کہو تم علائیا — کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

علائی کے پاس سے شمع کا ہٹ کر سامنے آنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی ۔ تعقیدوں سے الجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا ۔ اِن کے بس دو ہی شعر نمونہ کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں ۔

باز آتا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں — کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں

گو نزع میں ہوں میں ترے بن آئے جان من   کینے کا جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کے پڑھنے کی باری آئی فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں   ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر   گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنی باقی   کسی صورت نہیں زوال ہمیں
ترے غصے نے ایک دم میں کیا   مردۂ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیر رخشاں   اپنے ہی گھر میں ہیں وبال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ بٹیریں لڑانے کا بہت شوق ہے، شعر بھی خوب کہتے ہیں پڑھتے بھی خوب ہیں، پہلے احسان کے شاگرد تھے اور اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے، کوئی چالیس سال کی عمر ہوگی لکھا تھا۔

بسانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے   کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے گر ہم   یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کوئی بدمست تشنہ لب کی وہ خاک   کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا
بذوق ناز کو درخصت جفا کہ یہاں   نہیں بھی عزم سے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہی جن کو راز و نیاز   اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا انکو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا وہی پڑھ دیا اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی۔

اُٹھتا قدم جو آگے کو اُٹھے نامہ بر نہیں ۔۔۔ پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُس کا گھر نہیں
اور دل کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں ۔۔۔ خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تیری شکوہ کیا کریں ۔۔۔ اپنے ہی جب کہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی استاد احسان نے کہا، میاں عارف: میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں لاکھوں شعر سُنے لاکھوں سُنائے مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا۔

ان عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں سچ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہونگے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ سے رشک آتا ہے ۔۔۔ حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے
کعبے تک جاتے ہیں تجھی خاطر زاہد ورنہ ۔۔۔ دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے
جنسِ نزدیدہ کے مانند ہے اُلجھا فن جاں ۔۔۔ کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے
رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کہ یاں ۔۔۔ کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں زیورِ علم سے آراستہ اور لباسِ کمال سے پیراستہ صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت جب دیکھو یہ معلوم ہوتا مسکرا رہے ہیں طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی اس گوری سُرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کرتا جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے مگر کچھ دنوں سے اُن کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے، میاں ہُدہُد کو پال کر انہوں نے سب سے بگاڑ لی، شروع شروع میں تو اسکی ایسی

تبا ہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔ لیکن جب اُس نے استادوں پر حملے شروع کئے اُسوقت سے بُدبُد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہوگئی، غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں خود انہوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ کردیا ایک قطعہ لکھا تھا کہ ۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مملوک العلی نے کہا حکیم صاحب شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے، ہم جب تو ان کے شعر سمجھتے ہیں، پھر آپ نے ساتھ ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا مومن خاں نے کہا بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے، بہرحال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے تھے، میر صاحب نے بُدبُد کے مقابلے میں جو اعلان جنگ کیا وہ سُن چکے تھے اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوئے پڑھنے میں تامل کیا آخر مرزا فخرو کے اصرار پر یہ غزل پڑھی ۔

صلح اُن سے ہمیں کئے ہی بنی دل پہ جھگڑا تھا دل دیئے ہی بنی
زہد و تقویٰ دھرے رہے سارے ہاتھ سے اُس کے مے پیئے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار پاس اپنے بٹھلائے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عشق اُن جفاؤں پہ بھی جیئے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے صلی علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کے دل سے غبار کدورت دور کر دیا اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ ان سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو

کسی سے ملال۔ ہاں اگر پہلے کہیں میاں ہُدہُد چرک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا کہ انہوں نے پہلے ہی اس بکھیرو کی زبان بند کر دی، خیر۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیاؔ کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیاؔ ہیں جن کی تعریف مشاعرے میں آتے ہی ان کے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رساؔ نے فرمائی تھی، بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو اور ظریف آدمی ہیں کوئی ۳۵ - ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر ڈاڑھی منڈی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا سا۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی اب اپنا کلام استاد ذوقؔ کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھکو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے — اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا — ظلم کرنا تمہاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے
تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ — آج اسکی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا میاں حیاؔ! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے۔ حیاؔ نے جواب دیا۔ جی نہیں قبلہ میں نے تو استاد ذوقؔ کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں

سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد" بھلا صاحب عالم[۱] کب چپ کرنے والے تھے کہنے لگے۔ بھلا ہمارے مقابلے میں آپ کے استاد کا کلام کہیں پسند ہو سکتا ہے، جو چاہیں لکھیں، یہ بتائیے قلعے میں سانس مذکر ہے یا مونث بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے، ایسے جامع الکمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں اکثر ریختہ کہتے ہیں ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے، میں نے تو ریختے میں کبھی کوئی ان کی غزل دیکھی نہ سنی اس مشاعرے میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی، خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم — محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مردم و در چشم مردم عالمے تاریک گشت — من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست — جلوہ در ہر رنگ دیدم گرد نے حرم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من از ہجر دوست — داغ بر دل بردم و خلد بہشت جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد — مے ز خون دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے، مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے بیٹھے منہ دیکھا کئے، صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہاہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو اب سید ظہیر الدین خاں ظہیر کو سنیئے۔ ابھی ۲۰۔۲۲ سال کی عمر ہے۔ مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انکی طبیعت

---

[۱] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

اس بلا کی ہے، قد خاصہ اونچا چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن اونچی ستواں ناک آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ مگر گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پر پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے لکھنؤ والوں کے سخت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے ساتھ ہی، شارح ایک ایک لفظ کو سمجھانے جاتے ہیں، غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوق اُسکے آستاں کا — ارادہ، اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے — سُراغ نقشِ پا ہوں کارواں کا
رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اُٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے، بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دلِ بے تاب نے وہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا
ظہیرؔ آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقوے نے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہونگے جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی، اُن کا کیا کہنا استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں۔ انہوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اسکی وقعت بڑھی، یہ سنکر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظر سے بھی گر گیا زبان کے ساتھ مضمون کو تہہ تیغ دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک لفظ سمجھا سمجھا کر۔ آواز ایسی اونچی ہے کہ

دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے، غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا ذرا انگرکھا درست کیا، ٹوپی درست کی انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی۔

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ　　آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے　　جوں آفتاب در روشنیِ آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا　　وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں
مملک شیوہ، شوخ طبیعت زباں دراز　　ملزم ہوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو، مگر حضور　　اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کسی کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے، مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نومشقوں کے دل تو ہمیشہ تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آ جاتی ہے استادوں کے انھیں شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابلِ تعریف ہوں، اگر کسی شعر کی ذرا بھی بے جا تعریف کر دی جائے تو اس سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں، جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیئے شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں اور ان کے لئے یہ غزلیں استاد کی اصلاح سے کم فائدہ مند نہیں ہوتیں۔

اُن کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی، یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے۔ ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے، خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے، شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر

یہ تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود انہوں نے اپنے حالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں، وہ نقل کرتا ہوں:

قطعہ

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و ممنون — ہوئی احسان سے پر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض — طبع باریک ہوئی انکی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب — اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جنکی تمام — مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشاد — کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر انکو استاد کہو یا جو چاہے کہو۔ غزل بھی یہی پھیکا رنگ ہے مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا شہر ان کو استاد مانتا ہے، ہونگے ممکن ہے۔ میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی:

نظارہ برقِ حسن کا دشوار ہو گیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا
محفل میں تیرا اس لب میگوں کے سامنے — نامِ شراب پینے کے گنہگار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھہری نگاہ شوق — پردہ ہی جلوہ گاہ رُخِ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی — عاصی گنہ نہ کردہ گنہگار ہو گیا
اس کی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رنج — خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب — قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی۔ اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں، مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں، اور شاعر بھی کیسے کہ

پڑھے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالبعلموں کو سبق دے رہے ہیں، آواز بھی ذرا نیچی ہے۔ لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے، اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں اور بہت نیچی آواز میں ہاں مرزا نوشہ اُن سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے۔

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسمان زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں

شب اسکو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح
ہیں لب تو کیا، نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اُس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہیگی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے استاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے مگر بات یہہ ہے کہ اول تو داغ کو سب جانتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہہ داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے اُن کو استادوں میں جگہ ملی تھی۔ مگر انہوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے، ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرات سے پڑھنا واقعی کمال ہے، میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی، اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطف سوز و گداز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھئے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش شعر، وہ الفاظ کی نشست و بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ داغ کی بھولی بھالی شکل ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلی علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے، غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی، جب شمع حکیم مومن خان کے سامنے پہنچ گئی اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس پختہ کار استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انہوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو پیچھے کیا، آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی۔

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اُس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خلد ہے   کس جا پہ مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ
اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر   مومن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی ایک جادو تھا، تمام لوگ ایک عالمِ محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اسکو پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو زلفوں کو انگلیوں میں بل دے کر موڑنے لگے، کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعراء نے تعریف کی سنکر مسکرائے اور کہا آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں۔

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ   تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ان کے بعد شمع استاد حسان کے سامنے آئی، میں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی، مگر شمع پہنچتے ہی وہ تو بجلی سی بدل گئے کچھ سے کچھ ہو گئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر استاد ذوق کو ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو انہوں نے متوجہ کیا اسکو تعریف کرتے ہی بنی، ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا مگر ان کی استادی کی داد دینی چاہیئے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل صحیح کہہ گئے ہیں۔ ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دلِ محزوں   نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رولائے خدا
بتو بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دو گے جواب   خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندۂ خدا
رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف   جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل ہی احسان — یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہکر ایسے دلکش اور مؤثر لہجہ میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی کو محلس میں اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اسلئے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غزل پڑھ کے مسکرائے اور کہا "اب اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر اُن سے خدا سمجھے" حکیم آغا جان سمجھ گئے۔ اور کہنے لگے مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے؛ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاذ ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھکر

کہا - صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں ؟ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی شب ہجر کا مزا آ گیا - اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے ، اجازت ہو تو عرض کروں ، مرزا فخرو نے کہا - استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے ، غزل پڑھئے ، رباعی پڑھئے قصیدہ پڑھئے ، قطعہ پڑھئے غرض جو دل چاہے پڑھئے ہاں کچھ نہ کچھ پڑھئے ضرور ، - استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آئند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا -

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے
تب غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر و بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب کہ تجھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا ظلمت کے پردے ہیں کئے ظلم
ارے ظالم تیری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سنکر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو جا
بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت سے کہا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوع صبح سے منہ روشنی نے

کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات | یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو | پڑھی یاسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی | لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے | اذاں مسجد میں دی بارہ کسی نے
بشارت مجھکو صبح وصل نے دی | اذاں کے ساتھ ہی بین دو فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر | کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے
موذن مرحبا بر وقت بولا | تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پہ پہنچے تھے برابر کی مسجد سے آواز آئی اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر! اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے" اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے، دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے، یہ کہکر انہوں نے دونوں شمعوں کو جھکر کہا کہ اُن کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی۔

حضرات مشاعرہ ختم ہوا۔ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے ہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا۔

اچھا خدا حافظ۔

تقدیر

جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں

دوسرے روز سب سامان اُٹھ گیا اور پھر وہی چھاپے خانہ کی گھڑ گھڑ اور پریس مینوں کی گڑبڑ شروع ہو گئی، میں نے دوسرے مہینے پھر مشاعرے کا اعلان کیا اشتہار بھی تقسیم کئے مگر گنتی کے آدمی آئے آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی، کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے، غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکا نے مجھ سے فریب کر کے مطبع چھین لیا۔

ہر چند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعوےٰ کروں، حاکم بیشک میرا انصاف کریگا، لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہوا۔ اس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھئے کب چھپتے ہیں اور کون چھاپتا ہے۔ فقط۔

ملاپ پریس لاہور میں باہتمام ملک دل محمد پرنٹر چھپوا کر عزیز احمد پبلشر نے شائع کیا